زیرِ اہتمام:

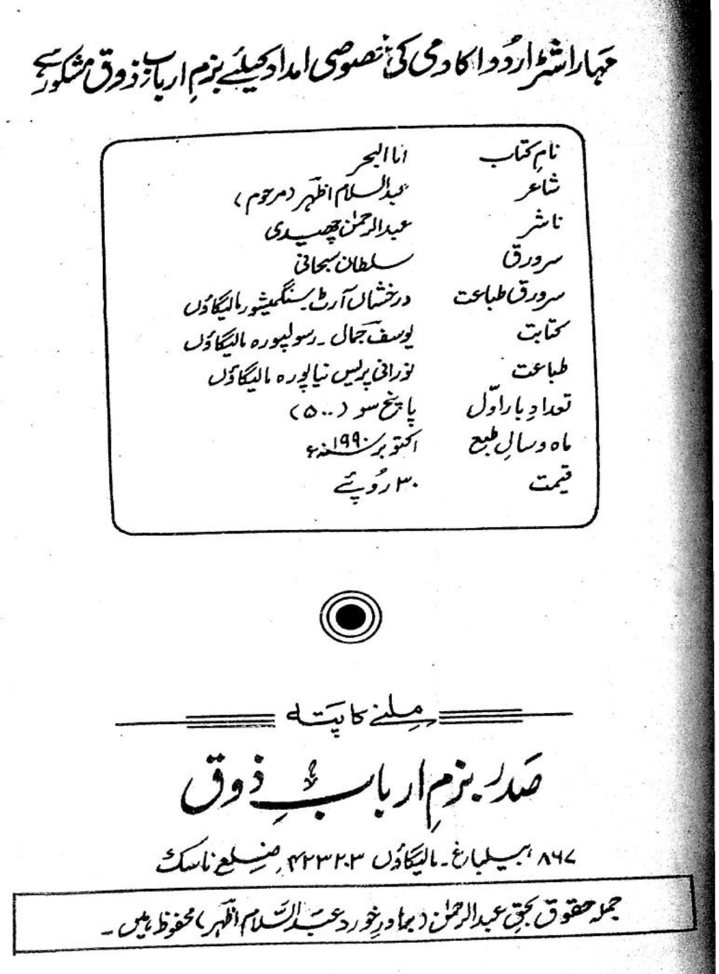
بزمِ اربابِ ذوق، مالیگاؤں

انا البحر

عبدالسلام اظہر (مرحوم)

اِک ہمہ گیری کا حامل قطرۂ آزاد بھی
آبروئے بحر بھی ہے بحر کی بنیاد بھی !

(عبدالسلام اظہر)



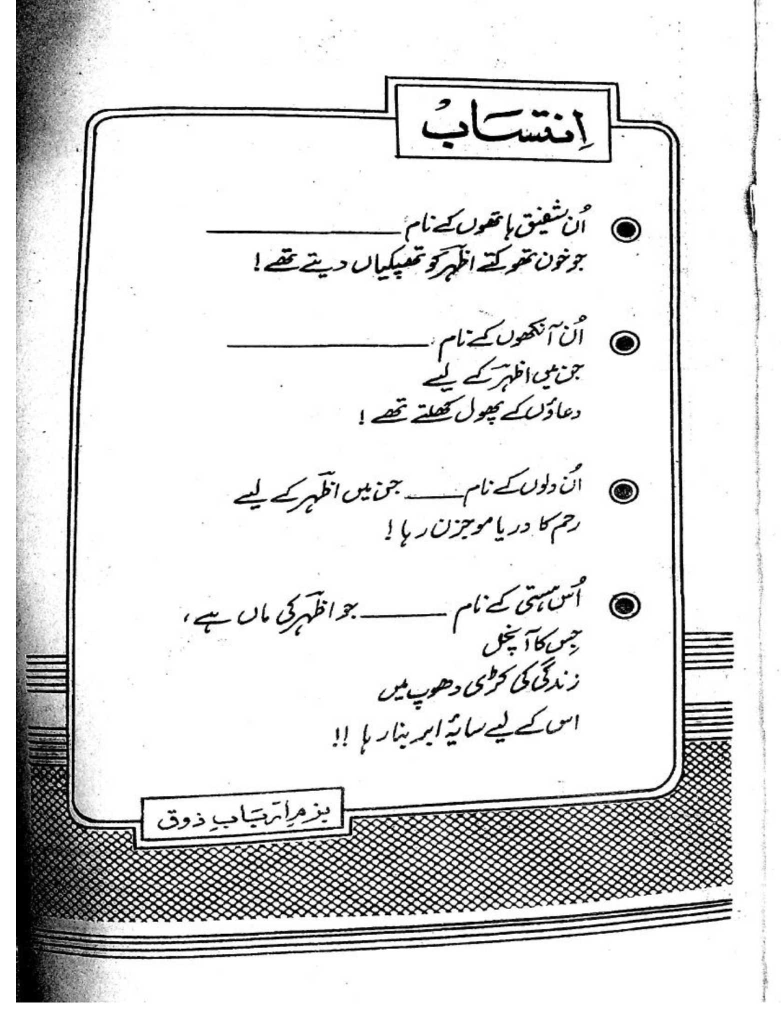
مہاراشٹر اردو اکادمی کی خصوصی امداد کیلئے بزمِ اربابِ ذوق مشکور ہے

نام کتاب	انا البحر
شاعر	عبدالسلام اظہر (مرحوم)
ناشر	عبدالرحمٰن چھیدی
سرورق	سلطان سبحانی
سرورق طباعت	درخشاں آرٹ سنگمیشور مالیگاؤں
کتابت	یوسف جمال ۔ رسولپورہ مالیگاؤں
طباعت	نورانی پریس نیاپورہ مالیگاؤں
تعدادِ باراوّل	پانچ سو (۵۰۰)
ماہ وسالِ طبع	اکتوبر ۱۹۹۰ء
قیمت	۳۰ روپئے

ملنے کا پتہ

صدر۔ بزمِ اربابِ ذوق

۸۶۷ بیلباغ ۔ مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ ضلع ناسک



اِنتساب

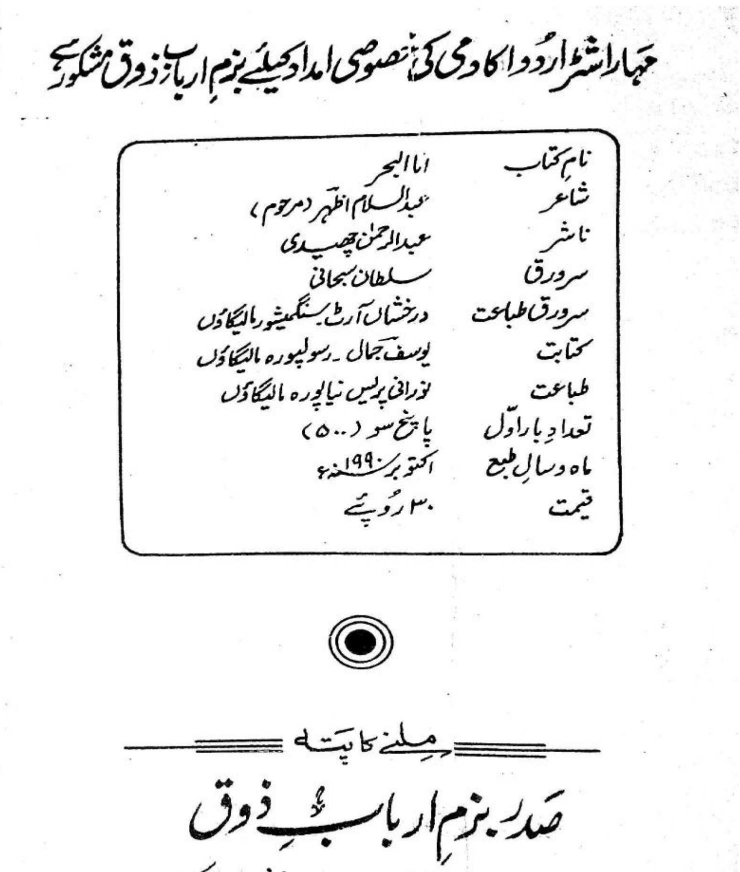
اُن شفیق ہاتھوں کے نام ——————
جو خون تھوکتے اظہر کو تھپکیاں دیتے تھے!

اُن آنکھوں کے نام ——————
جن میں اظہر کے لیے
دعاؤں کے پھول کھلتے تھے!

اُن دلوں کے نام —— جن میں اظہر کے لیے
رحم کا دریا موجزن رہا!

اُس ہستی کے نام —— جو اظہر کی ماں ہے،
جس کا آنچل
زندگی کی کڑی دھوپ میں
اس کے لیے سایۂ ابر بنا رہا!!

بزمِ اربابِ ذوق



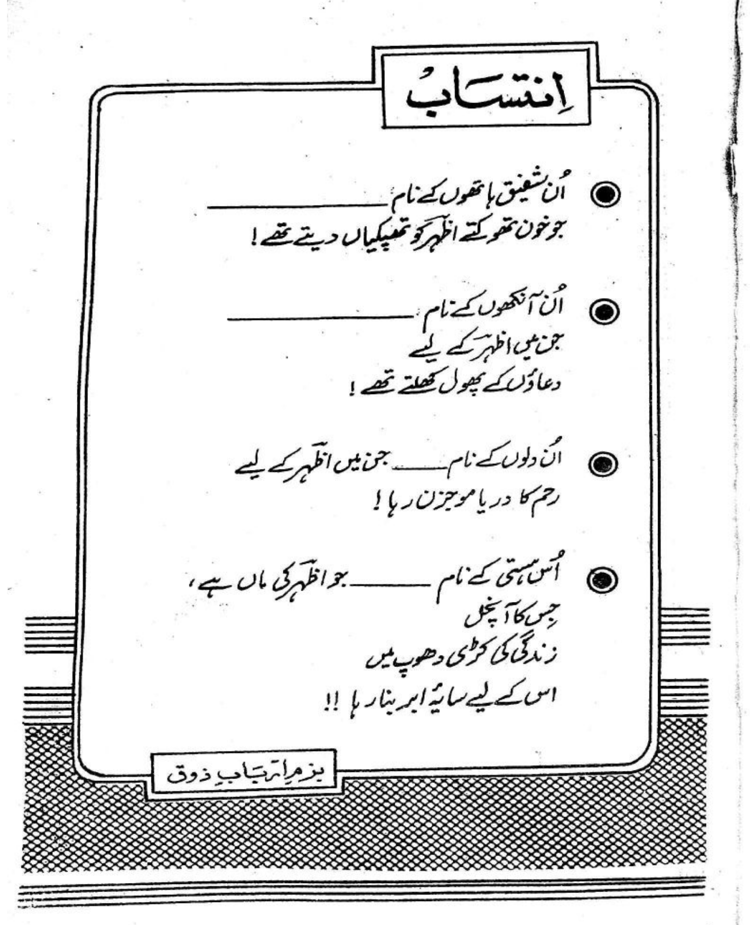
مہاراشٹر اردو اکادمی کی خصوصی امداد کیلئے بزمِ اربابِ ذوق مشکور ہے

نام کتاب	انا البحر
شاعر	عبدالسلام اظہر (مرحوم)
ناشر	عبدالرحمٰن چھیدی
سرورق	سلطان سبحانی
سرورق طباعت	درخشاں آرٹ۔ سنگمیشور مالیگاؤں
کتابت	یوسف جمال۔ رسولپورہ مالیگاؤں
طباعت	نورانی پریس نیا پورہ مالیگاؤں
تعدادِ بارِ اوّل	پانچ سو (۵۰۰)
ماہ و سالِ طبع	اکتوبر ۱۹۹۰ء
قیمت	۳۰ روپئے

ملنے کا پتہ

صدر بزمِ اربابِ ذوق

۸۶۷ اسپلباغ۔ مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ ضلع ناسک



اِنتساب

اُن شفیق ہاتھوں کے نام ــــــــــــ
جو خون تھوکتے اظہر کو تھپکیاں دیتے تھے!

اُن آنکھوں کے نام ــــــــــــ
جن میں اظہر کے لیے
دعاؤں کے پھول کھلتے تھے!

اُن دلوں کے نام ــــــ جن میں اظہر کے لیے
رحم کا دریا موجزن رہا!

اُس ہستی کے نام ــــــ جو اظہر کی ماں ہے،
جس کا آنچل
زندگی کی کڑی دھوپ میں
اس کے لیے سایۂ ابرِ بہار رہا!!

بزمِ اربابِ ذوق

چراغِ کشتہ

ڈاکٹر اشفاق انجم

سلام اظہر شاید پیدائشی بدنصیب تھا۔ مسرتوں اور شادکامیوں نے کبھی اسے منہ نہیں لگایا۔ ساری زندگی محنت و مشقت کرتا رہا، اور خون تھوکتا رہا۔ اس پر مزید ستم یہ کہ اس کے مدقوق جسم کو بیحد روشن اور تیز و طرار ذہن بخشا گیا تھا۔ جیسے گرم توئے پر سیماب رکھ دیا گیا ہو۔ اس کا ذہن خلد کی عظیم وسعتوں میں پرواز کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بال و پر موم کے بنے تھے۔ اپنی اس بے چارگی پر وہ روپڑتا تھا۔ اس کے اندرون کا لاوا پھوٹ بہنا چاہتا تھا۔ لیکن کہیں کمزور سطح نہیں مل رہی تھی۔ موسم پہ موسم تبدیل ہوتے رہے اور اس کی سخت مٹی آہستہ آہستہ نم ہوتی گئی۔ اور ایک دن یہ لاوا تمام بندشوں کو توڑ کر صفحۂ قرطاس پہ بکھر گیا۔ شعر کہہ کر اسے کچھ آسودگی محسوس ہوتی۔ اور پھر وہ اسی مشغلے میں کھو گیا۔ یہاں بھی بدنصیبی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جب پہلی بار اس نے مشاعرے میں اپنی غزل پیش کی تو مجاوران اور سجادہ نشینانِ ادب کے کان کھڑے ہو گئے سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ "ایں کیست ؟ " اور آخر ان کی نجی محفلوں سے فتویٰ جاری ہو گیا کہ یہ بے ڈھنگا سا نوجوان ایسی خوب صورت غزل کہہ ہی نہیں سکتا۔ یقیناً یہ کسی استاد شاعر کا کمال اور مالِ غنیمت ہے۔

انھیں مجاوروں میں سے ایک صاحب نے مجھے آگھیرا اور بڑے عجیب لہجے میں سخت سست کہنے لگے۔ میں نے سبب پوچھا تو چیخ کر بولے " تم نالائق ہو، تم بھی اپنے استاد (ادیب صاحب) کی روش اپنا رہے ہو۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ یاد رکھو! بہت پچھتاؤ گے۔"

میں نے حیران ہو کر کہا : "جناب! صاف صاف کہیئے مجھ سے ایسا کیا قصور سرزد ہو گیا ہے" فرمانے لگے : "تمھیں اس جاہل کو ایسی خوبصورت غزل دیتے ہوئے افسوس نہیں ہوا؟ " میں نے کہا "کون جاہل؟ ۔۔۔ اور کیسی غزل؟ " فرمایا : "وہی سلام اظہر اور یہ غزل۔ اتنا کہہ کر انھوں نے ایک شعر بھی سنا دیا۔ شعر سن کر واقعی میں چونک گیا۔ بڑا خوبصورت شعر تھا۔ جی خوش ہو گیا۔ ان صاحب سے خدا رسول

کی قسمیں کھا کر کہا کہ غزل تو کیا، اس میں ایک لفظ بھی میرا نہیں ہے۔ اور میں نے اس شاعر کا نام بھی پہلی بار سنا ہے۔" وہ صاحب کچھ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں رخصت ہو گئے۔ لیکن میں دیر تک اس شعر کو دہراتا رہا اور لطف لیتا رہا۔

اس واقعے نے دل کو ابھارا کہ اظہر سے ملا جائے۔ اتفاق سے وہ خود آ کر مجھ سے ملا اور اُن مجاوروں کی شکایت کرنے لگا۔ میں نے تسلّی دی، کہ ابتدا میں ادیب صاحب پر بھی یہی الزام تھا اور مجھے بھی ماخوذ کیا گیا تھا۔ تم اپنا کام کرتے رہو۔ ان لوگوں کے چکّر میں نہ پڑو۔ لیکن اظہر اس بات سے بیحد دل گرفتہ اور مایوس تھا۔ بحث و تکرار اور لڑائی جھگڑائی کے قابل تو تھا نہیں۔ اشعار میں اپنا بخار نکالنے لگا روزانہ ایک دو غزل کہتا اور آ کر مجھے سناتا۔ اس کی ہر غزل میں اس قسم کا کوئی نہ کوئی شعر ضرور ہوتا ؎

اظہر بصیرتوں کے پَروں سے اڑا ہوں میں
حیرت ہے کیوں زمین کو میری اُڑان پر

دھیرے دھیرے یہ طوفان تھمتا گیا۔ لیکن اس ابتدائی تجربے نے اظہر کے مزاج میں جڑ پکڑ لی اور وہ آخر دم تک اس احساس کا شکار رہا کہ لوگ اس سے حسد کرتے ہیں اور اس کی بیماری اور ناداری سے نفرت کی جاتی ہے۔ اس خیال کے ردِ عمل کی صورت میں وہ اپنے آپ اور اپنی شاعری سے جنون کی حد تک محبت کرنے لگا اور وہ اپنے گرد اک حصار بننے لگا، اور پھر وہ اسی حصار میں قید خود کو عظیم شاعر سمجھ کر خوش و خرّم رہنے لگا۔ اس خودساختہ مسرّت نے اسے خود پرستی میں مبتلا کر دیا۔ اب وہ کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ یہ جذبۂ خود پرستی ہی تھا جس نے اس سے ایسا شعر کہلوایا ؎

نئے عذاب تعاقب میں ہوں گے ہر لمحہ
پیمبری ہے یہاں حرفِ معتبر لکھنا

اور اس کے مجموعۂ کلام کا نام " انا البحر " بھی اس کے اسی مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔

اظہر کو اپنے اس مزاج کا خمیازہ اس طور بھگتنا پڑا کہ کسی سے بھی اس کی دوستی اور تعلقات زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکے۔ وہ لوگوں کے ساتھ مخلص نہیں تھا، اس لئے خود بھی خلوص کو ترستا تھا، لیکن وہ بھی کیا کرتا، تنہائی اس کا مقدّر ہو چکی تھی۔

اس شہر میں اظہر سے تعلقات اور دوستی کے دعوے دار تو بہت مل جائیں گے لیکن میرے سوا قربت اور رازداری کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کی ساری زندگی میرے سامنے ایک کتاب کی طرح کھلی رکھی ہے۔ بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں، جی چاہتا ہے کہ اس کی تمام خوبیوں اور خرابیوں کو کاغذ پر

منتقل کر دوں لیکن اک عجیب سے دکھ اور شرمندگی کا احساس ہوتا ہے کہ ہم نے بھی اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا اسے اپنے علاج کے لیے بار بار ہاتھ پھیلانے پڑے۔ ایسا نہیں کہ لوگوں نے اس کے ساتھ سلوک نہیں کیا۔ کیا لیکن ناکافی۔ وہ بھی خوددار اور خود پرست تھا۔ جب بھی ہاتھ پھیلائے اسے اپنے اندر دن میں کوئی شے چٹختی ٹوٹتی محسوس ہوتی۔ اس کے ہاتھوں میں لرزہ آجاتا اور وہ اپنی بیماری کو اس گداگری پر ترجیح دیتا اور علاج معالجہ سب ترک کر کے بیٹھ جاتا لیکن بھوک اور بیماری اسے پھر مجبور کر دیتی۔ وہ اپنی اس حالت سے تنگ آچکا تھا مرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ شاید اسی لیے اظہر نے بہت پہلے کہا تھا ؎

اندر کی آگ سب کو کہاں راس آتی ہے
کچھ لوگ کیمیا نہ ہوئے خاک ہو گئے

اندر کی یہ آگ مجاز، شکیب جلالی، نشاط شاہدوی اور میراجی کی طرح اظہر کو بھی راس نہیں آئی اور یہ بھی احساس کے دہکتے شعلوں میں تپ تپ کر کندن بننے کی تمنا میں خاک ہو گیا۔

میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ جب کسی نحیف و نزار فنکار کو اعلیٰ و حساس اور تیز و طرار دماغ مل جاتا ہے تو جسم اسے برداشت نہیں کر پاتا اور بہت جلد ان کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور اظہر تو ازلی کمزور تھا اس لیے یہ رشتہ داری تیس برس سے زائد نہ نبھ سکی۔

تیس برس کی عمر، کوئی خاص عمر نہیں ہوتی۔ یہ تو بچپن کے گزرنے اور جوانی کی آمد کے احساس کا زمانہ ہوتا ہے یعنی شعور و احساس ان دونوں کے علاحدہ علاحدہ شناخت قائم کرنے میں مصروف ہوتے ہیں یہ راستے پر چلنے کا نہیں، بلکہ راہ کو متعین کرنے کا وقت ہوتا ہے۔ لیکن اظہر کی زندگی میں یہ وقت شاید بہت پہلے ہی آگیا تھا اور اس کی فطری ذہانت نے اسے ایک راستہ بھی دکھلایا تھا، اور وہ تعلیم و تربیت سے دور شعر و ادب کے دشوار گزار راستے پر چل پڑا تھا۔ اس نے گلابوں کی آرزو میں اپنے تلوے لہولہان کر لیے۔ اظہر نے اگرچہ راستے میں ہی دم توڑ دیا لیکن اس کے لہو کا ایک ایک قطرہ اس راستے پر جگنو کی طرح چمک رہا ہے۔

اظہر کی ساری زندگی درد و کرب اور بے کسی میں گذری۔ غربت و افلاس اور بیماری نے اسے نفرت و حقارت کے سوا کچھ نہ دیا۔ اور جب باہر کی دنیا نے اس پر اپنے تمام دروازے بند کر دئے تو اس نے اپنے اندر ایک بیحد خوبصورت بستی بسالی۔

بیماری، بے بسی اور بے چارگی نے اظہر کو کچل کے رکھ دیا تھا۔ اس کا جسم بری طرح پائمال ہو چکا تھا لیکن ان مصائب نے اس کے دماغ کو بیدار اور عشق نے اس کے دل کو روشن بھی کر دیا تھا اور قدرت نے اسے قوتِ گویائی عطا کی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اظہر نے اپنے جمالیاتی احساسات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ

نہایت لطیف لفظیات کے حریری ملبوس میں پیش کیا ہے اس طرح ان ایسے منجھے اور نکھرے ہوئے جمالیاتی شعور کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

یاقوت لبوں کا پہلا لمس اظہر کی زندگی کا سب سے قیمتی لمحہ تھا۔ جس کی حلاوت نے تمام تلخیوں کو مٹا دیا اور وہ اس کی لذتوں میں خود فراموشی کی حد تک پہنچ گیا، اور یہ دوسرا حصار تھا جو اظہر نے اپنے گرد قائم کر لیا۔ اس زمانے میں اس کی نوکِ قلم نے بیحد حسین اور روشن ہیرے تراشے ہیں ؎

- رکھ دئے تھے کبھی اس پہ خوشبو نے لب — عمر بھر اک ستارہ رہا ہاتھ پر!!
- گلاب چہرہ، سمندر بدن سی اک لڑکی! — بنا گئی ہے مجھے رات کو کھنڈر لکھا
- سلگتے دشت میں تازہ گلاب کی صورت — کسی کے لمس کا لمحہ کھلا رہا مجھ میں
- خدایا ریشمی لمحوں کے نیچ رکھنا اسے — جلاتا ہے جو سر شام اک دیا مجھ میں
- نغمہ، گلاب، تتلی، ستارہ صبا ہے وہ! — یا پھر کہ گل پہ لکھی ہوئی اک دعا ہے وہ
- اس کے خیال سے ہے مری شاخِ جاں میں نم — آنکھوں میں روشنی کی طرح بس گیا ہے وہ

اظہر نے ایسی محبت اور حلاوت زندگی میں پہلی بار پائی تھی۔ وہ اس میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس لمس کی حلاوت نے اسے ایک اور لذت سے آشنا کر دیا۔ اور اس سمندر کی زبردست موجیں اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر ایک ایسے جزیرے میں چھوڑ آئیں جہاں ریت اور دھوپ کی تپش نے اس کا رہا سہا خون بھی چوسنا شروع کر دیا جس کے خیال سے اظہر کی شاخِ جاں میں نمی تھی جس کے نور سے اس کی آنکھیں روشن تھیں اور جس نے اسکے اندر ایک دیا جلایا تھا۔ اس دئے سے ایک لو پھوٹ نکلی اور اظہر کا تمام اندر ہی اندر سلگنے پگھلنے لگا اس کے اندر کی خوبصورت بستی میں زلزلہ آگیا۔ تمام خواب کھنڈر ہو گئے۔ ایک بار پھر وہ حقائق کی سنگلاخ وادیوں میں آگیا، اور اس کا گلاب سا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ایک بے نام سا درد پھر اس کے سینے میں سانسیں لینے لگا تمام زخم دوبارہ ہرے ہو گئے۔ اور وہ اپنے اندر ایک بار پھر بکھر گیا ؎

- کیسے کریں بیان کہ الفاظ ہی نہیں
  رکھ دو ہمارے درد کی شدت عجیب تھی
- پھر درد سانس لینے لگا موج کی طرح — میں تو سمجھ رہا تھا کہ سب زخم بھر گئے

اظہر کے زخموں کا پھر سے ہرا ہو جانا بہتر ہی ثابت ہوا۔ اور اس بے نام درد نے اس کو ایک نئی زندگی بخش دی۔ اب وہ اپنی ذات کے تمام حصاروں کو توڑ ایک وسیع دنیا میں پہنچ گیا۔ جہاں اسے ہر گام اک نئے طلسم سے دوچار ہونا پڑا۔ ان طلسمات نے اس کے شعور و فکر کے تمام دریچے وا کر دیئے ؎

- بکھری جو ٹکڑے ٹکڑے مری ذات، ہر طرف
آئے۔ نظر انوکھے طلسمات ہر طرف

اب اظہر ان طلسمات کو کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ آہستہ آہستہ تمام راز اس پر منکشف ہونے لگے۔ اس مقام پر اس کی شاعری اس راستے پر بڑھ جاتی ہے جہاں سے آفاقی شاعری کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔ چونکہ اس کے دماغ میں کڑی دھوپ اتر چکی تھی۔ اس لیے جہاں تک اس کی نگاہیں پہنچتی تھیں اسے روشنی ہی روشنی نظر آتی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں غیر محسوس طور پر ایک اجالا سا پھیلنے لگا جس کے طفیل اب وہ اشیاء اور جذبات دونوں کے اندر جھانکنے لگا۔ یہیں سے اپنے ذاتی درد و غم پر کائناتی درد و غم کے سائے حاوی ہونے لگے۔ اب دوسروں کے اشکوں کی تپش اور آہوں کا دھواں بھی اسے محسوس ہونے لگا اور وہ اظہار کا ایک نیا زاویہ مانگنے لگا ؎

- اظہار کے وہ زاویے ذہنوں کو بخش دے
رودادوں کی چیخ کو جو ابھارے زبان پر!!

اس مقام پر آ کر وہ نہ صرف روداد کی چیخیں سننے لگا بلکہ ان کے اسباب تک بھی اس کی نگاہیں پہنچنے لگیں ؎

- انسان کے حق میں اہلِ سیاست یا مفلسی
کچھ فیصلہ تو ہو کہ خطرناک کون ہے؟

قدرت نے لالۂ خود رو کی طرح اظہر کی ذہنی تربیت بھی اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا شعور پختہ اور نگاہ عمیق تھی۔ اس کا مطالعہ بیحد وسیع اور یادداشت غضب کی تھی ایک بار جو دیکھ لیتا اور جو کچھ سن پاتا اس کے ذہن پر نقش ہو جاتا تھا۔ اور پھر یہی نقوش اس کے تجربے کی سان پر چڑھ کر ایک نئے اور نتیجہ خیز روپ میں صفحۂ قرطاس پر ابھرتے تھے۔ اظہر مظلوم تھا۔ اس لیے ہر ظلم اور زیادتی پر وہ چیخ پڑتا تھا اور چلاتا ہے جس کے ساتھ ہو چیخ پڑتا تھا۔ اسے اس بات کا بھی شدید غم تھا کہ اس کی چیخیں صحرا کی صدا کی طرح ضائع ہو جاتی ہیں۔ اس زیاں پر وہ بجھ کر رہ جاتا تھا۔ اور اپنے ہنر کو رائیگاں تصور کرنے لگتا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ شانوں سے قلم کر دیئے ہوں اس کے نظریات اور حوصلوں میں دراڑیں پڑنے لگتیں ؎

- میں نے لکھا تھا رات سے لڑنا ثواب ہے
شانوں سے مرے ہاتھ قلم کر گیا کوئی!

- ہم ہوا کے زور سے لڑنے کو لوٹ جاتے مگر
خواب کی شاخوں پہ ظالم ایک بھی پتہ نہ تھا

سلام، اگرچہ شعائرِ دین سے دور تھا، لیکن اپنی اصل سے جڑا ہوا تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی اور تباہی اسے بھی بے چین رکھتی تھی۔ ملک میں ہونے والے ہر فساد میں وہ خود کو قتل ہوتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ ایسے عالم میں وہ بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا ہے ؎

- ربِّ عظیم میرے چراغوں کی لاج رکھ!
قبضہ جما رہی ہے سیہ رات ہر طرف

اظہر صرف دعا پر ہی بس نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی تباہی و بربادی کے اسباب بھی تلاش کرتا ہے، اور بالکل درست نتیجے پر پہنچتا ہے ؎

- شاخوں سے منسلک تھے تو جانِ بہار تھے!
شاخوں سے منحرف ہوئے خاشاک ہو گئے

- اِک قطرہ اوس کے لیے پھرتے ہیں شہر شہر
ہائے وہ لوگ جن پہ سمندر سبو ہوئے

- اِک چھت کے نیچے رہ کے بھی اک دوسرے کا خوف
آسیب کا ہے سایہ مرے خاندان پر!

کتنا صحیح تجزیہ ہے۔ آج قومِ مسلم کی تباہی کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ہم اپنی اصل سے ہٹ گئے ہیں۔ ہم میں اتحاد و اتفاق باقی نہیں رہا۔ حتیٰ کہ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے بھی ایک دوسرے سے بدظن اور خوف زدہ ہیں۔

اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی وہ پُر امید تھا۔ اسے اپنی روایتوں پر فخر اور اپنے عزم و اعتماد پر بھروسہ تھا۔ اسے اپنے قبیلے کی شجاعت پر ناز تھا۔ جو ساحل پر کشتیاں جلا دینے کا حوصلہ رکھتا ہے جو سر دے سکتا ہے، مگر تلوار نہیں۔ کیونکہ ؎

- مرا قبیلہ سپاہی نہیں مجاہد ہے
کسی بھی حال میں تلوار بیچتا ہی نہیں

- یہ رسم اب بھی ہے زندہ مرے قبیلے میں!
خود اپنے بہتے ہوئے خون سے وضو کرنا

اس اعتبار کا سہارا ابھی اظہرؔ کے لیے بہت تھا۔ اسی چراغ کی روشنی میں وہ حقائق سے نبرد آزما اور مفروضوں کی زہرناکی سے محفوظ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مفروضوں پر زندگی نہیں گذاری جاسکتی ؎

- میں مفروضے بسالوں اپنی سانسوں میں اگر اظہرؔ
حقائق کی صدی کا یہ سفر دشوار ہو جائے

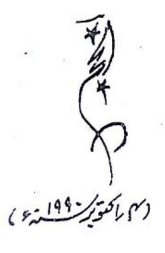
مسافر نوازی کے لیے سفر شرط ہے اور اظہرؔ کا قبیلہ تو کبھی بھی کسی ایک ٹکڑے کا اسیر ہو کر نہیں رہا۔ ساری زمین اس کے لیے اپنی باہیں پھیلائے ہوئے ہے۔ اگر ایک ٹکڑا چھن گیا تو کیا ؎

- ساری زمیں ہے آپ کی اٹھ کر سمیٹیئے!
ٹکڑا جو کھو گیا ہے تو کچھ غم نہ کیجئے

اظہرؔ کے اس یقین میں بڑی پختگی تھی۔ اُسے ناسازگار حالات سے ایک ضد سی ہو گئی تھی۔ وہ مایوس ہونے کی بجائے آمادۂ پیکار نظر آتا ہے اور چیخ چیخ کر کہتا ہے ؎

- ابھی دماغ سلامت ہے میرا ہم سفرو!
میں تپتے صحرا میں دریا کا خواب دیکھوں گا

اظہرؔ مر گیا ہے ــــ لیکن اس کا خواب زندہ ہے اور جب تک تپتے ہوئے صحرا میں دریا رواں نہیں ہو جاتا تب تک زندہ رہے گا ــــ!! ●●



(۴؍ اکتوبر ۱۹۹۰ء)

"....اضطراب دریا کا"

شبیرؔ ہاشمی

ہم عصر آوازوں کے ہجوم میں اپنی آواز کی شناخت اور شعری افق پر "مقامِ اعتبار" حاصل کرنے کی تگ و دو، دل لہو کرنے اور لہو کی آگ میں جلنے سے عبارت ہے لیکن اندر کی یہ آگ سب کو کہاں راس آتی ہے اور جس کو راس آجاتی ہے اس کے لیے شاعری محض فیشن یا لمحاتی شوق نہیں بلکہ اس کے وجود کی معنویت کا استعارہ بن جاتی ہے۔ مصلحت پرستی، منافقت اور ستائش بے جا سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کی سنگ حقیقتوں، اس کے مختلف رجحانات، میلانات اور تجربات کو ہمارے احساس تک اسی طرح پہنچا دیتا ہے جس طرح خود اس نے انہیں محسوس کیا ہے۔

عبدالسلام اظہرؔ جو معاشی اور جسمانی اعتبار سے انتہائی کمزور لیکن ذہنی اعتبار سے دانشور طبقے کا فرد تھا۔ زندگی کی تپتی ہوئی دھوپ میں پابرہنہ سفر کرتے کرتے اندر سے بالکل کٹ چکا تھا۔ اس ذاتی کرب نے اسے احساس کی غیر معمولی شدت سے روشناس کیا۔ حالات کی ستم رسیدگی، زندگی سے لمحہ بہ لمحہ دور اور موت سے قریب تر ہونے کے شدید احساس نے اس کی شاعری کی فضا کو المناک بنا دیا۔ حزن، مایوسی اکتاہٹ اس کی شاعری کے ایسے اساسی رجحانات ہیں، جو محض اس کی نفسیاتی واردات کا ہی نہیں، بلکہ اس کے وجود کی سچی تہہ داریت کا بھی پتہ دیتے ہیں۔ اس کے یہاں وقت کی تلخیوں اور تشنہ کامیوں کے اثرات ایک غم انگیز یاسیت کی صورت میں تو ملتے ہیں لیکن بے فیض قسم کی قنوطیت اور لایعنیت تک نہیں پہنچتے

- نہ آہٹوں کا تسلسل نہ کچھ صدا مجھ میں ــــ عجب سکوت کا صحرا اتر گیا مجھ میں
- سلگتے دشت میں تازہ گلاب کی صورت ــــ کسی کے لمس کا لمحہ کھلا رہا مجھ میں
- سلگتی ریت میں تلوے لہو لہو کرنا ــــ پھر اس کے بعد گلابوں کی آرزو کرنا
- اسے خبر نہیں اندر سے کٹ چکا ہوں میں ــــ وہ چاہتا ہے مرا پیرہن رفو کرنا

اظہرؔ نہ اپنی ذات میں گم ہو کر ماحول کو نظرانداز کرتا ہے اور نہ ماحول میں گم ہو کر اپنی ذات اور اس کے مسائل سے بے نیاز ہوتا ہے وہ عام انسانوں کی طرح اپنے اطراف کی زندگی کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کو دیکھتا ہے

اور عام انسانوں کی طرح ہی اپنے ردِّ عمل کا اظہار بھی کرتا ہے اس کی سماعت اس کے اطراف میں ٹوٹنے والے دلوں کی صدائیں سنتی ہے اور بصارت اس صدی کے ایک ایک لمحے کو برزخ بکف دیکھتی ہے۔ وہ مکان مکان ہونیوالی جنگوں اور شہر میں بگولوں کی شہر یاری کا گواہ ہے۔ وہ تپتے ہوئے صحراؤں میں دریا کے خواب اور تنکوں کو سخت لمحات و بپھرے ہوئے طوفانوں سے نبرد آزما دیکھنے کا آرزو مند ہے۔ وہ غلبۂ رہزن پرست کے انجام سے خوب واقف ہے۔ اسے اس بات کا دکھ ہے کہ "ہر بوالہوس نے حسن پرستی کو شعار بنا رکھا ہے" انسانی رشتوں کی پامالی اور اجتماعی دکھوں کا احساس سماج سے اس کی گہری اور بامعنی وابستگی کو ظاہر کرتا ہے وہ اپنے محسوسات و تجربات کے ہر اظہار میں بھی نہایت درجہ مہذب ہے۔ اسی لیے زندگی کی تنقید میں بھی اس کا احتجاجی لہجہ چیخ یا نعرہ نہیں بنتا لیکن وہ جدلیاتی طرزِ احساس تک ضرور پہنچتا ہے اس کے اشعار میں "عالم پناہ" "ظلِ الٰہی" "عزت مآب" "عالیجاہ" جیسی علامتوں کا برتاؤ اسی طرزِ احساس کا غماز ہے لیکن اس کے باوجود اظہر کسی نظریاتی دائرے میں قید نہیں ہوتا۔

غزل کی لطافتوں اور نزاکتوں سے بھی اظہر خوب واقف تھا۔ وہ روایتوں کی پاسداری کرتے ہوئے عصرِ حاضر کے ساتھ چلتا رہا۔ یوں بھی ہوتا رہا ہے کہ اکثر شعراء نئے شعری اسلوب کو محض تقلیدی طور پر اختیار کر لیتے ہیں وہ جدید حسیات اور اس کے شعور و ادراک سے قطعی نابلد ہوتے ہیں۔ جہاں کسی نے گھر، بچہ، کھلونا تنہائی، کربلا، اور اس کے متعلقات کو برتا خود بھی محض محلِ استعمال بدل بدل کر انہی لفظیات کو سطحی طور پر برتنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوششیں سستی شہرت اور وقتی "شورِ داد" سے نواز سکتی ہے لیکن یہ شاعری دلوں میں جگہ بنانے اور ادب میں مقام پانے سے محروم ہی رہتی ہے۔ اظہر ادب میں اور موجودہ عہد میں ہونے والی تبدیلیوں اور اس کے مسائل سے واقف تھا۔ جدید رجحانات اس کے یہاں تقلیدی طور پر نہیں بلکہ تخلیقی سطح پر ظاہر ہوتے ہیں اسی لیے اس کی شاعری فکری اور فنی سطح پر اپنے قاری کے لیے بیحد متاثر کن بن جاتی ہے۔ اپنے تجربوں اور جذبوں سے شاعر کی پرخلوص وابستگی موضوع کے اظہار میں اسی کی مناسبت سے اشارات و کنایات زبان و بیان اور تہہ داریت کو وضع کرتی ہے۔ اظہر کی زبان و بیان اگرچہ بہت سادہ ہے لیکن اس میں ایک مخصوص قسم کی تمکنت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اظہار و بیان کی اسی تمکنت نے اس کی شاعری میں وہ قوت پیدا کی جو اس کی خودداری اور انا کو مجروح ہونے سے بچاتی رہی۔

اظہر کا دل روشن اور فرد کی محبتوں سے معمور تھا۔ اس نے ایک باضمیر، خوددار اور خود شناس شاعر کی حیثیت سے مصلحت سے بے نیاز اظہارِ صداقت کو اپنی مخصوص انفرادیت کا حصہ بنا دیا اور یہی خوبی اظہر کی شاعری کی پہچان بن گئی۔ ••

شبیر ہاشمی

○

پنجے میں زرد رُت کے ہے ڈال ڈال ربّی!!
پیڑوں کو بخش دینا پھر سبز شال ربّی

پھر پختہ کر دے نسبت اُمّیؐ لقب نبیؐ سے
پھر بخش دے دلوں کو سوزِ بلال رضؓ ربّی!!

تو ہے کریم اتنا میری خطاؤں پر بھی
رکھی ہے آج تک جو روزی بحال ربّی

تیرے سوا کسی کے آگے جھکے نہ یہ سر
بس تیرے آگے پھیلے دستِ سوال ربّی!

رنگین بستیاں ہیں عرفاں دے نیک و بد کا
بحرِ ہوس سے میری کشتی نکال ربّی!!!

بس اک ترا سہارا ہم کو بچائے ورنہ
ہے ارضِ ہند ہم کو کوفہ مثال ربّی

○

جذبات کو وجود تلک یوں رسائی دے
رگ رگ میں اس کے دل کا دھڑکنا سنائی دے

تجھ سے بچھڑ کے جُرم تھا پھولوں کو دیکھنا
اب جو سزا دے آنکھوں کو وہ انتہائی دے

نافذ ہوا ہے کیسا یہ آئینِ احتیاط
اپنا مکان بھی ہمیں زنداں دکھائی دے

خوف و ہوس سے پاک کوئی ایسی رُت ملے
جو تتلیوں کو "حوصلۂ پَر کشائی" دے

قطرے کی خودشناسی نے اعلان کر دیا
"زنجیرِ موج موج" سے مجھ کو رہائی دے

اظہر! یہ باڑھ تیروں کی ممکن ہے ایک روز
پھر سبز طائروں کو فلک آشنائی دے

○

سُلگتی ریت میں تلوے لہو لہو کرنا
پھر اس کے بعد گلابوں کی آرزو کرنا!

اسے خبر نہیں مَیں کٹ چکا ہوں اندر سے
وہ چاہتا ہے مرا پیرہن رفو کرنا

یہ مشغلہ نہیں مرہم ہے دل کے زخموں کا
تمام رات ستاروں سے گفتگو کرنا

یہ رسم اب بھی ہے زندہ مرے قبیلے میں
خود اپنے بہتے ہوئے خون سے وضو کرنا

برس کے رہ گئیں شمشیریں میرے شانوں پر
میں چاہتا ہی تھا آئینہ روبرو کرنا

"خوش روحِ بزرگاں" نیا سلطان کرے گا
اندھوں کو خزانے کا نگہبان کرے گا

زد میں اگر آ جائے گا حاکم کا قبیلہ
قانون میں ترمیم کا اعلان کرے گا

کب ہو گا سبک لہروں سے چٹانوں میں رستہ
یہ کام تو بپھرا ہُوا طوفان کرے گا

دیوانوں کی تنہائی پسندی کا یہ جذبہ
شہروں کو کسی روز بیابان کرے گا

تھک ہار کے جب رات کو گھر لوٹوں گا اطہرؔ!
اِک سایہ ستائے گا پریشان کرے گا

چہرے ہر اک نقاب سے جب پاک ہو گئے
اطہرؔ تمام آئینے سفّاک ہو گئے

ننھی سی لَو کے سر کو اٹھانے کی دیر تھی
ہلکی ہوا کے جھونکے غضبناک ہو گئے

اندر کی آگ سب کو کہاں راس آتی ہے
کچھ لوگ کیمیاؔ نہ ہوئے خاک ہو گئے

خوشبو کو پھیلنے کی ہوس حد سے جب بڑھی
تو شاخ شاخ کلیوں کے تن چاک ہو گئے

شاخوں سے منسلک تھے تو جانِ بہار تھے
شاخوں سے منحرف ہوئے خاشاک ہو گئے

O

بکھری جو ٹکڑے ہو کے مری ذات ہر طرف
آ ئے نظر انوکھے طلسمات ہر طرف !

عالم پناہ کے نئے منشور کے طفیل !
منڈلا رہے ہیں جنگ کے خطرات ہر طرف

قانون کے لباس میں دربارِ عدل سے
بھیجی گئی ہے زخموں کی سوغات ہر طرف

خوشبو کو قید کرنے کی سازش غلط ہے
موجِ صبا نے رکھی ہے یہ بات ہر طرف

ربِّ عظیم ! میرے چراغوں کی لاج رکھ!
قبضہ جما رہی ہے سیہ رات ہر طرف

پہلی سی وہ سکون کی سانسیں کہاں گئیں؟
آندھی اٹھا رہی ہے سوالات ہر طرف!

اِک سر، بلند کیا ہوا شہرِ یزید میں
نکلی چمکتے نیزوں کی بارات ہر طرف

انجام دیکھو "غلبۂ رہزن پرست" کا
نفرت، عذاب، آگ کی برسات ہر طرف!

○

رسوا ہوئے، ذلیل ہوئے، کُو بہ کُو ہوئے
جس لمحہ "سگ وطیرہ" ہمارے عدو ہوئے

شمشیر کھینچ کر کہا ظلِّ الٰہی نے!
دیکھیں زمیں کے زخم کہاں تک رفو ہوئے

سوچو! کہ سرحدوں کے تقاضوں سے کیا ملا؟
دریا تھے ہم سمٹ کے مگر آبجو ہوئے

اِک قطرہ اوس کے لیے پھرتے ہیں شہر شہر
ہائے وہ لوگ جن پہ سمندر سبو ہوئے

پہلے ہوائے شام نے لکھا تمہارا نام
پھر اس کے بعد سارے مناظر لہو ہوئے

بیساکھیوں کا جادو بھی کتنا عجیب ہے
اظہر امام بونے یہاں سرخرو ہوئے

○

احساس کا وہ بوجھ ہے ننھی سی جان پر
ہو جائے ریزہ ریزہ جو رکھ دوں چٹان پر

الفاظ گم دعاؤں کے اور ذہن منتشر!
اپنا لہو اچھالئے اب آسمان پر!

اک چھت کے نیچے رہ کے بھی اک دوسرے کا خوف
آسیب کا ہے سایہ مرے خاندان پر

ننگی حقیقتوں کا جزیرہ دکھاؤں گا
زحمت نہ ہو تو آئیے میرے مکان پر

اظہار کے وہ زاویے ذہنوں کو بخش دے
روحوں کی چیخ کو جو ابھارے زبان پر

اظہر بصیرتوں کے پروں سے اڑا ہوں میں
حیرت ہے کیوں زمیں کو میری اُڑان پر

○

ضدّی سیاہ قلب غضبناک کون ہے
تاریخ سے یہ پوچھ تہہِ خاک کون ہے

شاہانِ بحر! آپ کی دہلیز یں چوم کر
موجیں سوال کرتی ہیں تیراک کون ہے

اِنساں کے حق میں اہلِ سیاست یا مفلسی
کچھ فیصلہ تو ہو کہ خطرناک کون ہے؟

دانشوروں کی ساری دلیلوں کو کر کے رد
کاغذ کہے گا صاحبِ ادراک کون ہے

نادیدہ انگلیوں سے جو آہستگی کے ساتھ
کرتا ہے چاک کلیوں کی پوشاک! کون ہے

○

جلتے مکان، دار و رسن، رات اور میں!
ڈستی ہوئی فضائے وطن، رات اور میں

رگ رگ میں خواہشوں کا دہکتا ہوا الاؤ
آنکھوں میں اک سلونا بدن، رات اور میں

گاؤں سے آ کے کیا ملا رنگین شہر میں
فٹ پاتھ، کنکروں کی چبھن رات اور میں

اِک موجِ اضطراب میں ڈوبے ہوئے ہیں سب
جگنو ستارے چاند گگن رات اور میں

سارے بدن پہ سرد خموشی کا پیرہن
آنکھوں میں چیختی سی جلن رات اور میں

اظہرؔ سیاہ چبھتے سوالوں کے درمیاں
احساس کی لرزتی کرن، رات اور میں!

○

نہ آہٹوں کا تسلسل نہ کچھ صدا مجھ میں
عجب سکوت کا صحرا اُتر گیا مجھ میں

بلا سبب نہیں برگشتگی ہواؤں کی !
چھُپا ہُوا ہے اثاثہ بہار کا مجھ میں

سلگتے دشت میں تازہ گلاب کی صورت
کسی کے لمس کا لمحہ کھِلا رہا مجھ میں

زمیں کے چاند دریچہ ترا مقام نہیں
قیام کر میری آنکھوں میں جگمگا مجھ میں

خدایا ریشمی لمحوں کے بیچ رکھنا اسے
جلاتا ہے جو سرِ شام اک دِیا مجھ میں

○

اُس نے لکھا تھا رہتے ہیں حاتم نسب یہاں
شانوں سے کاٹے جاتے ہیں دستِ طلب یہاں

بارُود کے دھماکوں سے آنکھیں اُبل پڑیں !
ایسے منایا جاتا ہے جشنِ طرب یہاں

سُورج کو مٹھیوں میں چھپانے کی آرزو !
سودا سما گیا ہے سروں میں عجب یہاں

کیوں رُک گئے ہو نا پوچھیاں اپنا راستہ
نیزے سدا چمکتے رہے بے سبب یہاں

کھو جائے گا نشان تک آغوشِ خاک میں
عکسِ تہہِ وجود ابھارے گا جب یہاں

تبدیل کر زمین کو دریائے نیل میں
فرعونیت کے نشے میں ڈوبے ہیں سب یہاں

○

جس کو تلاش رہتی تھی ہر پل سکون کی
کرنے لگا ہے اِن دنوں باتیں جنون کی

ہاتھوں میں لیے ایک بکھرتا ہوا گلاب
تشریح کر رہا ہے کوئی اندرون کی !

ہو گا عمل سلگنے کا اب اور تیز تر
لرزا دیا ہے دل کو ہواؤں نے جون کی

ادراک اس کا رکھتی ہیں بجھتی ہوئی رگیں
کتنی عظیم ہوتی ہے اک بوند خون کی

اظہر! اکھڑتی جا رہی ہے زمیں کی سانس
اور جنگ ہے خلاؤں میں علم و فنون کی

○

ثابت وجودِ اہلِ ستم کر گیا کوئی
اونچا لہو میں ڈوبا عَلَم کر گیا کوئی

مَیں نے لکھا تمھارات سے لڑنا ثواب ہے
شانوں سے میرے ہاتھ قلم کر گیا کوئی

کچّی کلی پسند ہے عزّت مآب کو
دیوار ول پہ یہ بات رقم کر گیا کوئی

شاید کہ اُن میں جاگ اٹھی تھی کوئی کرن
کچھ آئینوں کو شہر سے کم کر گیا کوئی

رکھ کے مرے بدن میں اداسی کی ایک موج
چپکے سے میری آنکھوں کو نم کر گیا کوئی

○

خزانہ آنکھوں کا ایسے کہیں لٹا ہی نہیں
کوئی بھی شخص یہاں خواب دیکھتا ہی نہیں

مرا قبیلہ سپاہی نہیں مجاہد ہے
کسی بھی حال میں تلوار بیچتا ہی نہیں

پڑی ہے فکر خلاؤں میں رنگ بھرنے کی
زمیں کا قرض ابھی تک ادا ہوا ہی نہیں

مرے وجود نے خوش فہمی خاک کر ڈالی!
وہ مطمئن تھے کہ بستی میں آئینہ ہی نہیں

جو جانتا شجرِ سایہ دار کی عظمت
تو ننھے پودوں کو پیروں سے روندتا ہی نہیں

یہ نسل پہلے ہی پہچان کھو کے بیٹھی رہتی!!
اور اب لبوں پہ کسی کے کوئی صدا ہی نہیں

ہوا کے زور سے آنکھیں ملائیں، جنگ کریں
نئے پرندوں میں اظہر یہ حوصلہ ہی نہیں

○

خلا میں چاند ستارے بکھیر کر صاحب
ہمیں دیئے گئے کمزور بال و پر صاحب

لکھا تھا میں نے بکھرتے گلاب کا نوحہ
ہوائیں پوچھتی پھرتی ہیں میرا گھر صاحب

تمام اشک دیئے خون تک نچوڑ دیا ! !
مگر نہ سبز ہوا بیسواں شجر صاحب

سلگتی ریت سفر میں ہے ساتھ ساتھ مرے
ہے جب سے ہونٹوں پہ اک حرفِ معتبر صاحب

کہاں اجالے کہ دستک دروں پہ دیتا ہے
سیاہ شال میں لپٹی ہوئی سحر صاحب

تمنّا تھی کہ بدن کے پڑاؤ سے نکلوں
ہوں اب تو خوش کہ ملا مژدۂ سفر صاحب

○

منتظر ہے برسوں سے میرے گھر کا سنّاٹا
کوئی توڑ دے آکر بام و در کا سنّاٹا

ہاتھ تیری یادوں کے رکھ گئے ہیں بستر پر
کانٹے رت جگوں کے اور رات بھر کا سنّاٹا

زندگی کی ہلچل میں ڈوبتا رہا ہوں پر
ناچتا ہے صحرا کی دوپہر کا سنّاٹا

جانے کتنے جذبوں کی چیخ دفن ہے اس میں
بند مقبروں جیسا چشمِ تر کا سنّاٹا ! !

جسم سارا جلتا ہے دیکھتا ہوں جب اظہر !
چاندنی کی باہوں میں بحر و بر کا سنّاٹا

○

سخت لمحات دے، بپھرے طوفان دے
تنکوں کو ان کی ہستی کا عرفان دے

خاک اور خوں میں ڈوبی زمیں کو سنوار
خشک پیڑوں کو اب سبز رت دان دے

وادیٔ سنگ سے تا رگِ برگِ گل
چیختے نقش خوشبو کا وردان دے

منجمد شب میں سورج ابھر آنے کا
ٹمٹماتے دیے جیسا امکان دے

تتلیاں زرد بچوں کے ہاتھوں پہ رکھ
ان کے معصوم ہونٹوں کو مسکان دے

کیا کروں گا فرشتوں کی بستی میں میں
میرے اطراف مجھ جیسے انسان دے

○

کچھ سرفروش اس طرح میداں میں ڈٹ گئے
عالم پناہ! جنگ کی بازی الٹ گئے

میں سامنے ہی والا تھا گرتا ہوا علم
پیچھے سے ایسا وار ہوا ہاتھ کٹ گئے

صحراؤں کو غذائی ضرورت نگل گئی
شہروں کی زد میں آ کے سمندر سمٹ گئے

تھا حادثہ عجیب کہ میرے مکان سے
دیوانہ وار آگ کے شعلے لپٹ گئے

پھر ان بکھرنے والوں کی مٹی سے ایک دن
ایسا غبار اٹھا کہ آئینے اَٹ گئے

○

کیا دے گی تجھ کو جرأتِ اظہار دیکھنا
چومے گی جسم تیر دل کی بوچھار دیکھنا

آنکھیں کھلی رکھو کہ میاں ہر طرف یہاں
کاجل چرانے والے ہیں عیّار دیکھنا

کچھ کی ہے ننھے بچوں نے گُلکاریٔ خیال
یارو! ہمارے شہر کی دیوار دیکھنا

روتا ہے دیکھ دیکھ کے تازہ گلاب کو
لاحق ہوا اسے عجب آزار دیکھنا

دستِ صبا سے خوشبو کا رشتہ نہیں رہا
تقدیر میں ہے کیا کیا مرے یار دیکھنا

جب پھوٹ جائیں گے مرے پیروں کے آبلے
صحرا میں پھر ہرے بھرے اشجار دیکھنا

جاناں! جوان رکھتا ہے شوریدگی کی رَو
خوابوں میں تیرے گیسوئے خمدار دیکھنا

رَن سے بلاوا آتے ہی اِک خواب سا لگا
آنکھوں پہ پھر ترے لب و رخسار دیکھنا

جب کائنات سوتی ہو اَٹھہر سکون سے
ہم دِل جلوں کو ایسے میں بیدار دیکھنا

○

لہو کے پھول کہیں بھی نظر نہیں آتے
لگے ہے اب یہاں آشفتہ سر نہیں آتے

ہزاروں آنکھیں بجھاؤ، مگر یہ یاد رہے
گرفتِ جبر میں خوابِ سحر نہیں آتے

تمام راستے صحراؤں کے مُقفّل ہیں
کسی بھی راہ سے جاؤ شجر نہیں آتے

جو تیز و تند ہواؤں کی صَف کو چیر سکیں
سبھی کے حصّے میں، وہ بال و پر نہیں آتے

ہمارا عہد بھی بکھرا ہوا سمندر ہے
کنارے گم ہیں جزیرے نظر نہیں آتے

کچھ ایسی بے خودی اظہر شفق جگاتی ہے
کہ اپنے آپ میں ہم رات بھر نہیں آتے

○

اِک ہمہ گیری کا حامل قطرۂ آزاد بھی!
آبروئے بحر بھی ہے بحر کی بنیاد بھی

آگے آگے چل رہا ہے خوبصورت گھر کا خواب
پیچھے پیچھے ہے مرے طوفانِ برق و باد بھی

ڈوبتی آوازوں کی صَف سے ذرا ہی دور پر
شاہِ عالم! گونجتا ہے اِک نئی فریاد بھی

ہو گئی ویران باہر کی ہَوا کے زہر سے
ورنہ یہ بستی تھی صاحب کل تلک آباد بھی

بدلا بدلا ہے مزاجِ اہلِ قریہ اِن دنوں
اب اثر کرتے نہیں ہیں آپ کے ارشاد بھی

شوق سے کاٹو سروں کی فصل لیکن سوچ لو
کہ ہوا کرتی ہے ہر موسم کی اِک میعاد بھی

○

دھوپ کی شدت بنی کالی گھٹا میرے لئے
ہاتھ اٹھا کر اس نے جب مانگی دعا میرے لئے

یادوں کی پرچھائیوں کے ساتھ لیکر آئے گی
اس کی زلفوں کی مہک موجِ صبا میرے لئے

میں کہ مہرِ نیم شب مجھ کو بجھانا ہے محال
سازشیں کر یا کہ دیواریں اٹھا میرے لئے

چین سے سو جاؤں گا جب میں دکھوں کی گود میں
سر پٹک کر روئے گی وحشی ہوا میرے لئے

مسئلوں کی فوج کے ہمراہ اس کے شہر میں
منتظر تھی اک طلسماتی فضا میرے لئے

○

خواہش کہاں کہ خواب نیا دیجئے مجھے
آنکھیں بجھا سکوں یہ دعا دیجئے مجھے

کب تک گرفتِ موجۂ صرصر کا سلسلہ؟
اب تو سراغِ شہرِ صبا دیجئے مجھے

رہ رہ کے چیخ اٹھتی ہے لاشوں تلے زمیں
عالم پناہ! سبز قبا دیجئے مجھے

اب تو گلی گلی یہاں میدانِ جنگ ہے
تلوار کھینچنے کی ادا دیجئے مجھے

تاریخ ہوں نوشتۂ دیوارِ وقت ہوں
طاقت ہو آپ میں تو مٹا دیجئے مجھے

میں بانٹتا ہوں سانسوں کی تہذیب کا شعور
"کالے سمندروں کی سزا دیجئے مجھے"

○

کشتیاں بھونکنا دریا کے سفر میں رہنا
اِس قبیلے کی تو فطرت ہے بھنور میں رہنا

سایۂ دار و رسن آٹھوں پہر رہتا ہے
کھیل سمجھے ہو صفِ اہلِ نظر میں رہنا

جب کڑی دھوپ دماغوں میں اُتر آئی ہو!
راس کیا آئے گا آغوشِ شجر میں رہنا

خواب سے آگے کی منزل ہوں مجھے خود میں سمیٹ
مجھ کو منظور نہیں دیدۂ تر میں رہنا

کھا گئی رشتوں کی پہچان غلافوں کی وبا
اجنبی کی طرح اب اپنے ہی گھر میں رہنا

آزمائش کا ہے لمحہ کہ چراغوں کے لئے
حکم آیا ہے ہواؤں کے اثر میں رہنا

منسلک رکھتا ہے تہذیب دہُنر سے مجھ کو
ایک چہرے کا مرے دیدۂ تر میں رہنا

چاندنی پھول شفق تِتلی ستارے جگنو
چاہتے سب ہیں مرے نقشِ ہنر میں رہنا

کہہ دیا ہو گا صبا سے تری زلفوں نے کبھی!
انگلیاں تھام کے خوشبو کی سفر میں رہنا

مضطرب رکھتا ہے سورج کو، ہوا کو اظہر!
ایک پتّے کا ابھی شاخِ شجر میں رہنا

○

مجھ کو تنہائی کا یہ دشتِ بلا دیتے ہوئے
آنسو آنسو ہو گیا کوئی دعا دیتے ہوئے

سبز پرچم جس قبیلے کا ہے اس کو دیکھنا
اس زمیں کو سبز موسم کی قبا دیتے ہوئے

کس میں کتنا زور ہے یہ فیصلہ ہو جائیگا
دشمنو! آؤ مقابل میں صدا دیتے ہوئے

راکھ ہو جاتے ہیں جانے کتنے ہی معصوم خواب
سوچتا ہے کون شعلوں کو ہوا دیتے ہوئے

صبح تک اس کی حفاظت کی بہت تلقین کی
دستِ شب میں شام نے جگنو دیا دیتے ہوئے

○

راہِ ہوس کو اور بھی ہموار مت کرو!
نادانو! اس شاہزادے کو بیدار مت کرو

یہ کہہ رہے ہیں دھوپ کے سفاک زاویے
اب اعتبارِ سایۂ اشجار مت کرو

اک حملہ فتحیاب کرے گا ہمیں مگر
میرِ سپہ کا حکم ہے یلغار مت کرو

شب زادو! آؤ سامنے روشن چراغ کے
چھپ کر منافقوں کی طرح وار مت کرو

دراّنہ شور کرتی ہوئی آئیں آندھیاں
اس طرح اپنے آپ سے انکار مت کرو

پہلے ہی سے ہے زندگی جیسے کوئی سزا
اب سانس لینا اور بھی دشوار مت کرو!

○

تتلی ستارے پھول لطافت خریدیئے
اپنا ضمیر بیچیے، جنت خریدیئے

نیزے صلیب آگ کی چادر لہو کی موج
سچ بولئے تمام اذیّت خریدیئے

پھر کس کے پیر چومے گی صحرا کی تپتی ریت
دیوار و در ہمارے لئے مت خریدیئے

کس نے کہا غلافوں سے یوں رشتہ جوڑ کر
چہرے سے آئینوں کی بغاوت خریدیئے

دریا کی تہہ پکارے گی سارے وجود کو
ہرگز نہ آبلی پریوں کی الفت خریدیئے

اس شوخ کی گلی میں کسی نے یہ لکھ دیا!
ہوش و خرد گنوائیے وحشت خریدیئے

پہلے خود اپنی آنکھوں میں کانٹے چبھوئیے
تب میر اور فراق سی عظمت خریدیئے

○

ہے ذرّہ ذرّہ کتنا چمکدار دیکھنا
اظہرؔ رہِ حریفِ شبِ تار دیکھنا

اُس مردِ حق شناس کی کوشش سے بن گئے
بدعت کے صحرا دین کے گلزار دیکھنا

آیا تھا سنگ ریزوں کی بستی سنوارنے
اس نے تراشے گوہرِ شہوار دیکھنا

میں بے خبر کم نظر ہوں مری اشکباری کیا
دیدہ وروں کے دیدۂ خونبار دیکھنا

نیندوں کو قتل کر کے جلاتا رہا دماغ
مقصد تھا اس کا قوم کو بیدار دیکھنا

ہے کون سایہ بخش یہاں اس شجر کے بعد
سر پہ سلگتی دھوپ کی بوچھار دیکھنا

○

اپنی نیت، اپنے مسلک کو عیاں اس نے کیا
امن کی بستی کو شہرِ خونفشاں اس نے کیا

اپنی ضد، اپنی خباثت کی بلندی کے لئے
ننھے ننھے بچوں کو بے سائباں اس نے کیا

سوئے ایراں دیکھ کر کہتی ہے رُوحِ ابرہہ
مرحبا! میری روایت کو جواں اس نے کیا

اتری جب اس کے عمامے کی سیاہی دل تلک
بانیوں کو موت کا کالا دھواں اس نے کیا

جانبِ ارضِ مقدّس جامۂ احرام کے
کیسی کیسی وحشتوں کو ہم عناں اس نے کیا

اپنی کالی ذہنیت کی پردہ پوشی کے لئے
بے ردا اظہرؔ سرِ دوشیزگاں اس نے کیا

○

دہلیزِ مصلحت پہ یہ سر خم نہ کیجیے
مٹ جائیے انا کو مگر کم نہ کیجیے

پہچانتا ہے کون سلیقوں کی نرمیاں
برباد اپنی ذات کا ریشم نہ کیجیے

ہے شورشوں سے بچنے کا آسان راستہ
اپنے مفاد کو کبھی پرچم نہ کیجیے

کچھ واقعات کے لیے رکھیے سنبھال کر
ہر حادثے پہ آنکھوں کو یوں نم نہ کیجیے

ساری زمیں ہے آپ کی اُٹھ کر سمیٹیے!
ٹکڑا جو کھو گیا ہے تو کچھ غم نہ کیجیے

○

نغمہ، گلاب، تتلی، ستارہ، صبا ہے وہ
یا برگِ گل پہ لکھی ہوئی اک دعا ہے وہ

یہ کائنات میرے لئے کالی رہگزر
اور رہگذر میں جلتا ہوا اک دیا ہے وہ

اس کے خیال سے ہے مری شاخِ جاں میں نم
آنکھوں میں روشنی کی طرح بس گیا ہے وہ

میں عکسِ آرزوئے شبِ ہجر ہوں یہاں
کاغذ پہ لفظ لفظ جسے لکھ رہا ہے وہ

میرا وجود ہے کسی ویراں مکان سا
اور اس میں بھولے لمحوں کا اک قافلہ ہے وہ

رہتا ہے ساتھ ساتھ بچھڑنے کے بعد بھی
اظہرؔ رفاقتوں کا عجب سلسلہ ہے وہ

○

بے چین رُوح جسم کے اندر ہے آب آب
کوزے میں بند گویا سمندر ہے آب آب

بدلی ہے رُت تو دیکھنے والے نہیں رہے
ایسی بہار ہے کہ گلِ تر ہے آب آب

آئینہ توڑنے کو اچھالا گیا مگر
خود اپنا عکس دیکھ کے پتھر ہے آب آب

سب پڑھ رہے ہیں اپنی بصیرت کا مرثیہ
اندھوں میں کربِ ذات کا منظر ہے آب آب

تعبیر کی صلیب سے ابھرے ہیں یوں سوال
جیسے ہر ایک خواب پگھل کر ہے آب آب

ہم محوِ خواب برف کے جس مقبرے میں ہیں
اظہرؔ اسی پہ دھوپ کا لشکر ہے آب آب

○

چند آنسو خونِ دل حرفِ دُعا لے جائیگی
صاحبو! یہ رات ہم سے اور کیا لے جائیگی

رکھ کے ٹھنڈے خون میں آتشکدہ یہ چاندنی
قطرہ قطرہ نیند آنکھوں سے اٹھا لے جائیگی

جاتے جاتے رات اک محتاط لڑکی کی طرح
سب ستارے اپنے آنچل میں چھپا لے جائیگی

قتل کر دو گے مجھے تو فتح کی صورت میں پھر
دشمنوں کی فوج میرا "خوں بہا" لے جائیگی

کِس کو تھا معلوم نِکّے قائدوں کی رہبری
چھین کر تلواریں ہم کو کربلا لے جائیگی

کِس طرح دیکھو گے اظہرؔ اپنے چہرے کے نقوش
عکسِ دشمن یہ ہوا جب آئینہ لے جائیگی

○

ہوں کوئی پت جھڑ کے پیڑ جیسا بہار دینا
اسے "موسمِ ہفت رنگ" مجھ کو سنوار دینا

دھنک بدن کی لبوں کی سرخی جبیں کی شبنم
میں کورا کاغذ ہوں کچھ تو نقش و نگار دینا

حصارِ تیرہ شبی میں دل بستگی کی خاطر
سیہ فضاؤں کو جگنوؤں کی قطار دینا

کسی بھی صورت یہ کالی راتیں گذار لیں گے
ہے شرط لیکن سحر ہمیں شاندار دینا

اب اور کب تک تمازتوں کے عذاب جھیلوں
جو ہو سکے تو شجر کوئی سایہ دار دینا

تری طرف میں اڑوں گا نازک پروں سے اپنے
مگر حدِ لامکاں سے مجھ کو پکار دینا

نہیں ہے مشکل ہمارے دستِ ہنر کے آگے
سیہ چٹانوں پہ عکس کوئی ابھار دینا

ہے ٹوٹنے کو الجھتی سانسوں کی ڈور اظہر
نقاب چہرے پہ جتنے ہیں سب اتار دینا

○

اُداس شام کے سائے میں بیٹھ کر لکھنا
بچھڑنے والی کچھ احوالِ چشمِ تر لکھنا

ہمارے شہر کا موسم ترے لبوں جیسا !!
تو اپنے شہر کے موسم کا کچھ اثر لکھنا

یہ رات ہجر کی سادہ ورق کے جیسی ہے
تو آنسوؤں سے مرا نام رات بھر لکھنا

عجب جنوں ہے کہ تیرے صبیح چہرے کو
کبھی بہار کبھی جنّت نظر لکھنا

گلاب چہرہ سمندر بدن سی اک لڑکی
سکھا گئی ہے مجھے رات کو بھنور لکھنا

تمام آنکھوں پہ عینک سجی ہوئی ہے یہاں
جواز رکھنا کسی کو جو دیدہ ور لکھنا

ہمارے عہد میں زندہ مزار چلتے ہیں
ہر اک وجود کی تہہ میں یہ ڈوب کر لکھنا

نئے عذاب تعاقب میں ہوں گے ہر لمحہ
پیمبری ہے میاں حرفِ معتبر لکھنا

ہزار دل مشعلے جیتے ہیں میری چھاؤں میں
اے عہدِ نو کے مورّخ مجھے شجر لکھنا

○

منجمد ماحول بے صوت و صدا چاروں طرف
رقص میں ہے ہول سناٹا رہا چاروں طرف

باغبانِ لم یزل خوشبو کو دے اذنِ سفر
جستجو کرتی ہے آوارہ صبا چاروں طرف

اس صدی کا لمحہ لمحہ ہے صبا جو برزخ بکف
آگ کے شعلوں سے ہے لکھا ہوا چاروں طرف

ساری قدریں آبدیدہ سب صحیفے دم بخود
سایۂ تشکیک ہے پھیلا ہوا چاروں طرف

اتنی سمتیں تھیں کہ منزل تک پہنچ پائے نہ ہم
زاویہ در زاویہ الجھاؤ تھا چاروں طرف

کس طرح دیکھوں میں اظہرؔ داغِ رخسارِ وجود؟
آئینے کردار کے ہیں بے ضیا چاروں طرف

○

اجالوں کی کبھی اس طرح سے یلغار ہو جائے
تسلسل رات کا خود ہی سحر آثار ہو جائے

اگر اپنی بصیرت کی شعاعیں لفظ میں رکھ دوں
تو چشمِ لفظ سے جاری لہو کی دھار ہو جائے

ہے محرومی کے شعلوں کا ہدف اک اک نفس میرا
خوشی کے خواب دیکھوں زندگی آزار ہو جائے

مسرّت کے پیمبر نے مجھے اتنی دعا دی ہے
اذیّت کے دہکتے دشت سے تو پار ہو جائے

میں مفروضے لبالوں اپنی سانسوں میں اگر اظہرؔ
حقائق کی صدی کا یہ سفر دشوار ہو جائے

Scanned by CamScanner

○

خبطِ دماغ پہ مُصر ہے جدّت کا مرثیہ
انگشتِ موم اور تمازت کا مرثیہ

مایوسیوں کی دھوپ ہے صحرائے ذات میں
لکھئے سنہرے خوابوں کی لذّت کا مرثیہ

قدروں کے اتصال کا تحفہ ہے اور کیا
تہذیب و فکر و فن کا بصیرت کا مرثیہ

اپنی صدی کی شرح میں لکھنا پڑا مجھے
کردار اور خلوص کی عظمت کا مرثیہ

کترا رہے ہیں لوگ اب اپنے ہی عکس سے
ہر آئینہ ہو جیسے شباہت کا مرثیہ

آظہر وہ کیسے لوگ ہیں جن کا نصیب ہے
اِک سرد پایہ رگِ گل کی محبت کا مرثیہ

○

ہزار طرح کے خود پر عذاب دیکھوں گا
میں جب کبھی کوئی تازہ گلاب دیکھوں گا

ابھی دماغ سلامت ہے میرا ہمسفرو!
میں تپتے صحرا میں دریا کا خواب دیکھوں گا

میں اتنا عام کروں گا ہنر چراغوں کا
کہ ذرّے ذرّے میں اِک آفتاب دیکھوں گا

کہیں مکان دیے، ٹکڑا دے سبز موسم کا
میں اپنے پیروں میں کب تک رکاب دیکھوں گا

میں گھر پہنچتے ہی دو جھیل جیسی آنکھوں میں
چراغ پھول شفق ماہتاب دیکھوں گا

○

فن کے موتی فکر کے گلہائے تر دیکھے گا کون ؟
پتھروں کے شہر میں لعل و گہر دیکھے گا کون ؟

کر گیا معتوبِ احساسِ صلیب شعلگی!
جلتے دل، جلتی نگاہیں، جلتے گھر دیکھے گا کون ؟

سبز رت کی صبح ملبوسِ تمازت ہو اگر
زرد موسم کی سلگتی دوپہر دیکھے گا کون؟

قید ہیں اپنی حدوں میں سب لکیریں کھینچ کر
فاصلوں کی دھوپ میں جلتے شجر دیکھے گا کون؟

"کرب" بینائی کا میں الفاظ میں رکھ دوں مگر
شیشۂ الفاظ میں عکسِ نظر دیکھے گا کون؟

جل رہا ہے ذات کے برزخ میں احساسِ یقین
"اب کے رت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون؟"

تھا درِ ادراک پر تحریر اطہرؔ یہ سوال!
زرد خوابوں میں پلی تتلی کے پر دیکھے گا کون؟

○

جس وقت عالیجاہ کے تیور بگڑ گئے !!
دو چار کوڑے پشت پہ سب کی ہی پڑ گئے

شاید کہ آندھیوں میں سیاسی شعور تھا
سب سایہ دار پیڑ جڑوں سے اکھڑ گئے

تھے ساتھ ساتھ مرحلۂ لب کشائی تک
پھر سارے ہمسفر مرے مجھ سے بچھڑ گئے

آنکھوں میں آسمان لئے چل رہے تھے سب
اِک موڑ ایسا آیا کہ ٹکرا کے لڑ گئے!

اندر سے ریگ زار کیا کس طلسم نے
آنکھوں کے چاند بجھ گئے اور دل اجڑ گئے

پہنچی ہے اس مقام پہ آسائشوں کی چاہ
اظہر ہوس کے نیزے دماغوں میں گڑ گئے

○

آئے گا ایسا وقت بھی عالم پناہ پر
حُجرے میں چھُپ کے روئیں گے تخت و سیاہ پر

اِنصاف کی طلب یہاں جرمِ عظیم ہے
آویزاں کر دو لکھ کے ہر اک عدل گاہ پر

نِکلی محل سے ملکۂ عالم کی موت اور
پہرے لگائے جاتے رہے شاہراہ پر

مَیں سانس لے رہا ہوں یہ کیسے دیار میں
سب لوگ ناز کرتے ہیں اپنے گناہ پر

ساری زمین بیچ کے اِنسان آج کا !!
نظریں لگائے بیٹھا ہے اب مہر و ماہ پر

○

سرحدوں پر سکوت طاری ہے
اور مکانوں میں جنگ جاری ہے

چیخ کر رو رہے ہیں سناٹے
ایسے ظالم کا وار کاری ہے!!

شہر سے رونقوں نے ہجرت کی
اب بگولوں کی شہر یاری ہے

کیا کہا ابر نے سمندر سے
موج در موج بے قراری ہے

اے گھنے پیڑ میں کہاں تجھ سا
سبز موسم سے تیری یاری ہے

کاش! کاغذ پہ منتقل ہوتی
میرے اندر جو جلوہ باری ہے

○

جھونکے نئی رُتوں کے عجب کام کر گئے
سارے گلاب خشک ہوئے رنگ مر گئے

اُڑتی ہے دُھول آنکھوں کے ویران دشت میں
سب جگمگاتے خواب نہ جانے کدھر گئے

میں چپ تھا اور ذہن کی سُنسان راہ سے
پرچھائیوں کے چیختے لشکر گذر گئے

پھر درد سانس لینے لگا موج کی طرح
میں تو سمجھ رہا تھا کہ سب زخم بھر گئے

مالک ہیں اس کے ہم یہ ہماری زمین ہے
اِس ایک بات پہ یہاں کتنوں کے سر گئے

ہم بوریہ نشینوں کی گردن نہ جھک سکی!
حربے رئیسِ شہر کے سب بے اثر گئے

○

مَیں ریت جگنوں کو تھپیل کے جب مَسپر بن گیا
تِنکا تھا چشمِ وقت میں شہتیر بن گیا

جب مَیں میں گم تھا کچھ نہ تھا میری گرفت میں
ٹوٹا حصارِ ذات سمہ کپر بن گیا

دستِ سکوں خلاؔ سے بلاتا رہا مگر..!
اِک چہرہ میرے پاؤں کی زنجیر بن گیا

حالات لے کے آ گئے یہ کیسے موڑ پر ؟
جھونکا صبا کا جلتا ہُوا تیر بن گیا

گُل بوٹوں سے وہ کھردرے کاغذ سنوار کر
فن اور لہُو کے رشتے کی تفسیر بن گیا

اِس درجہ خوف کھاتا ہے سورج سے کیوں وجود
کیا برف پر لکھی ہوئی تحریر بن گیا

مہنگا پڑا لہو کے تقاضوں سے انحراف
اظہرؔ لہو اُگلنا ہی تقدیر بن گیا

○

خوابوں کی تتلیوں سے اگر دل لگاؤ گے
تنہائیوں میں رات کی آنسو بہاؤ گے

اِک دھند چاٹ جائے گی چہرے کے سب نقوش
آئینہ توڑنے کی سزائیں بھی پاؤ گے

بارود، موت، ریت کی چادر، دھوئیں کے پھول
اِس طرح سے زمین کو کب تک سجاؤ گے

کب توڑتی ہیں رُوح کے رشتے جدائیاں
ہر لمحہ آنسوؤں میں مرے جگمگاؤ گے

جب دل میں پھوٹ نکلیں گی یادوں کی کونپلیں
آنچل میں اپنے اس گھڑی آنسو چھپاؤ گے

مجبور کتنا ہوتا ہے ہر اک عظیم شخص
یہ راز جب عظیم بنو گے تو پاؤ گے!

کر دو گے کائنات کو زیر و زبر سلام
اظہر کی بد دعائی سے تم ہار جاؤ گے!

اپنے لہو کی آگ میں جلتی ہے یہ صدی
شعلے قدم قدم پہ اگلتی ہے یہ صدی

باہر سے خوشنما مگر اندر سے کھوکھلی
گہوارۂ تضاد میں پلتی ہے یہ صدی

برگ و شجر کے حسن کو ترسے گی کل ہر آنکھ
شادابیاں زمیں کی نگلتی ہے یہ صدی

حیراں ہیں آئینے کہ نہیں عکس مستقل
ہر لمحہ اپنا چہرہ بدلتی ہے یہ صدی

دیتی ہے پہلے جنگ کے شعلوں کو خود ہوا
اظہر پھر اپنے ہاتھوں کو ملتی ہے یہ صدی

خوشبو شعاع کیف سراپا امنگ تھی
ساعت تمہارے قرب کی صد موجِ رنگ تھی

موقع ملا تو اپنے ہی چہرے سے ڈر لگا
آئینہ دیکھنے کی ہمیں کب امنگ تھی

باقی مہکتے خوابوں کی دلہن کس طرح
وہ نسل جس کو خود ہی سے درپیش جنگ تھی

اپنے لہو کی آگ میں جھلسا تھا ہر بدن
حیراں تھے عقل و ہوش بصیرت بھی دنگ تھی

اظہر تھی جس کی ڈور ہواؤں کے ہاتھ میں
میری حیات ایسی بھٹکتی پتنگ تھی!

○

رگ رگ میں اک کھنچاؤ تھا، حالت عجیب تھی
پچھلے پہر جو ٹوٹی قیامت عجیب تھی

دہکا گئی وجود میں پھر خواہشوں کی آگ
پوشیدہ چاندنی میں تمازت عجیب تھی

پتھر میں بھی لگاتے تھے لہروں کا ہم سراغ
بخشی گئی جو ہم کو بصیرت عجیب تھی

انصاف بہہ رہا تھا دلیلوں کی لہر میں
آئین تھا عجیب، عدالت عجیب تھی

حیراں تھا پیشِ آگہی پیکر قیاس کا
آئینہ سامنے تھا شباہت عجیب تھی

خاموشیوں کی گرد تھی ہونٹوں پہ تہہ بہ تہہ
آنکھوں میں چیختی ہوئی وحشت عجیب تھی

کیسے کریں بیان کہ الفاظ ہی نہیں
لکھ دو ہمارے درد کی شدّت عجیب تھی

کھوئی ہوئی حیات تھی آغوشِ رنگ میں
اظہرؔ! وہ چند لمحوں کی قربت عجیب تھی

○

چمکتے خوابوں کی بستی بسانے والی ہے!
ہوا جو تیرے جھروکے سے آنے والی ہے

بجھائے جاتی ہے اک ایک کر کے سارے دیئے
یہ رات پھر کوئی طوفاں اٹھانے والی ہے

کنارے رہنے دو قانون کی کتابوں کو!
کہ شاہزادی عدالت میں آنے والی ہے

کبھی تو لگتا ہے یہ قوم یوں ہی سوتے ہوئے
تباہی اپنا مقدّر بنانے والی ہے

مرے جوانوں کو اطہر خبر نہیں اسکی
سروں پہ ان کے قیامت جو آنے والی ہے

○

سایۂ بارش اور خوشی سے زیست کا رشتہ نہ تھا
جبر کی زد میں تو انساں یوں کبھی آیا نہ تھا

ہم ہوا کے زور سے لڑنے کو لڑ جاتے مگر
خواب کی شاخوں پہ ظالم ایک بھی پتّہ نہ تھا

تشنگی کے اس دہکتے قطرے کی تجسیم ہوں
کافی سیرابی کو جس کی ایک بھی دریا نہ تھا

زرد ہو پائے نہ جو اپنے ہی زہرِ عکس سے
آئینے کے سامنے ایسا کوئی چہرا نہ تھا

ساری تاریخیں نفی کرتی گئیں اس امر کی
روشنی آزاد تھی اس پہ کوئی پہرا نہ تھا

کیسے دے اطہر وہ خوشبو کے جزیروں کا پتہ
جس کی قسمت میں کوئی مہکا ہوا لمحہ نہ تھا

کرب کی دسترس سے نکلے گا
جب انا کے قفس سے نکلے گا

اجڑی بستی میں رنگ و بو کا جلوس
کیا خبر کس برس سے نکلے گا

جانے کب چاند میری خواہش کا
یاس کی دسترس سے نکلے گا

دل مسرت کا آئینہ ہو گا
جب حصارِ ہوس سے نکلے گا

راستہ خوشبوؤں کی وادی کا
ذات ہی کے قفس سے نکلے گا

انقلابِ نظام برحق ہے!
کس صدائے جرس سے نکلے گا

روح کی آگ مت جگا اظہر!
شعلہ اک اک نفس سے نکلے گا

تیز آندھی میں جلتا دیا ہاتھ پر
رکھ کے نکلا ہوں میں معجزا ہاتھ پر

ہم سے درویشوں کو ہفت اقلیم ہے
یہ ٹپکتا ہوا آبلہ ہاتھ پر!!

رکھ دیئے تھے کبھی اس پہ خوشبو نے لب
عمر بھر اک ستارہ رہا ہاتھ پر

خون میں ڈوب کر دھوپ چنتا رہا
جانے کیسا عجب قرض تھا ہاتھ پر

میری پہچان فتنے نکلتے نہیں
رکھ گیا ہے کوئی آئینہ ہاتھ پر

یہ محافظ ہے اظہر مری آن کا
لمحہ لمحہ ہو فضلِ خدا ہاتھ پر

جو چاندنی میں اکیلی حیات ہوتی ہے
تو ایسی رات قیامت کی رات ہوتی ہے

وہیں پہ ہے مری پہلی اڑان کی منزل
جہاں پہ ختم حدِ کائنات ہوتی ہے

خدایا! سایۂ شمشیر کو گھنا کر دے
اسی میں میری نمودِ صفات ہوتی ہے

جیالو! فتح کی مستی میں یہ خیال رہے
کبھی خود اپنے لہو سے بھی مات ہوتی ہے

تمام رنگوں کی ہجرت کے بعد بھی اظہر!
نہ جانے کون سے موسم کی بات ہوتی ہے

○

ہماری بستی دیارِ سحر گزیدہ ہے
ہر ایک لب پہ سیہ رات کا قصیدہ ہے

ہمارے واسطے کوئی شفیق ہاتھ کہاں
سروں پہ سایۂ شمشیرِ آبدیدہ ہے

نہ جانے کس کی نظر کھا گئی جوانوں کو
بجھی بجھی سی ہیں آنکھیں کمر خمیدہ ہے

عزیزِ شہر شہادت ہے سب خلاف مرے
مرا گواہ مرا دامنِ دریدہ ہے!!

لہو سے جو نئے نقشے بنانے نکلی ہے
وہ فوج تیرے مظالم کی آفریدہ ہے

ہمارے سچ کی حمایت کرے گا کون اظہرؔ!
کہ فرد فرد یہاں کا زباں بریدہ ہے

○

لہولہان ہیں آنکھیں عذاب مت دینا
ہمیں کسی نئے موسم کا خواب مت دینا

مزاج پوچھے گا پھر سارے خشک زخموں کا
ہمارے ہاتھوں میں تازہ گلاب مت دینا

خدایا! وہ بڑے حساس دل کا مالک ہے
سکون دینا اسے اضطراب مت دینا

دھنک نے اس کے قدم چوم کر دعا مانگی
کسی کو ایسے غضب کا شباب مت دینا

کہاں کہاں پہ گذارے ہیں ہجر کے لمحے!
وہ شوخ پوچھے تو کوئی جواب مت دینا

درختِ انار کا سایہ فگن ہوا ظہرؔ پہ
جو یہ نہیں تو شبِ ماہتاب مت دینا

○

دل کے زخموں کی یوں خوشبو نے مسیحائی کی !
گُل گزیدوں نے بگولوں سے شناسائی کی

ہاتھ میں یوں ہی نہیں آئی ہے موجوں کی لگام
ہم نے اک عمر سمندر سے حریفائی کی

خیر آئے ہو تو آنکھوں کو بچائے رکھنا
قیمتیں لگتی ہیں اِس شہر میں بینائی کی

چاہے کچھ بھی ہو مگر اُڑنا ہَوا کے رُخ پر
کچھ پرندوں کے لئے بات ہے رسوائی کی

سر اُچھلنے کا ، زباں کٹنے کا موسم آیا !
سامنے آئے جسے تابِ ہو گویائی کی !!

○

کچھ دعا کے پھول اشکوں کے گہر رکھ دیگا وہ
میرے ہاتھوں پر یہی زادِ سفر رکھ دیگا وہ

دھوپ پھر قبضہ کرے گی فاتحانہ شان سے
کاٹ کر بستی کے جب سارے شجر رکھ دیگا وہ

آئینوں سے عکس لیجائے گی اک اندھی بلا
چہرہ چہرہ جب نقابوں کا ہُنر رکھ دیگا وہ

اپنی ہستی کو مٹا کر آنے والوں کے لئے
رات کے کالے جزیرے میں سحر رکھ دیگا وہ

رات دن مانگیں دُعائیں جس سپاہی کیلئے
کس کو تھا معلوم کہ تیغ و سپر رکھ دیگا وہ

اس گھڑی جوشِ ہجومِ سنگِ فطرت دیکھنا
جب شجر پہ برگ شاخوں پہ ثمر رکھ دیگا وہ

○

آب دیکھ نہ پاؤ گے کِھلتے ہوئے پھولوں کو
یہ نسل چڑھاتی ہے پروان ببولوں کو

شہزادے نے پہلا ہی فرمان کیا جاری
اب موجِ صبا لکھو آوارہ بگولوں کو!!

سینے ہوئے چھلنی تو، یہ شور، یہ ماتم کیوں
خود تم نے توانائی بخشی ہے ببولوں کو!

دیوار ہو کوئی بھی شق ہو گی کلی جیسی!!
معیار بنا لینا خوشبو کے اصولوں کو!

مٹی کے بلاوے میں تاثیر ہی ایسی تھی
رخصت کیا شاخوں نے ہنستے ہوئے پھولوں کو

○

لُٹ کر بھی قاتلوں کو قصیدے سناؤ گے
نادانو! اپنے آپ کو کتنا گراؤ گے

کچھ فائدہ نہ دے گا تمہیں "جشنِ مصلحت"
یوں ہی ہمیشہ اپنے لہو میں نہاؤ گے

یہ ناگ کے پجاری، یہ تفریق کے امین
ان سے سوائے زہر کے کچھ بھی نہ پاؤ گے

عینک سجی ہے اِن کی ہی منصف کی آنکھ پر
اِنصاف لینے کس کی عدالت میں جاؤ گے

گھر تک نہ اپنے آئیں گے اب آگ اور خون
یہ جھوٹے خواب آنکھوں میں کب تک سجاؤ گے

تب ختم ہو گا کالے عذابوں کا سلسلہ
جب تم مجاہدوں کی طرح سر اٹھاؤ گے

○

جو اُس کا چاند سا چہرہ نظر نہیں آیا
تو پھر سکون ہمیں رات بھر نہیں آیا

مرض ہے یا کہ سزا یا کسی کی سازش ہے
ہرے درختوں پہ کوئی ثمر نہیں آیا

اے شب گزیدو! اندھیروں کے باب میں لکھا
چراغ کیا کوئی جگنو ادھر نہیں آیا

نصیب والے ہیں نسبت ہے جن کو سائے سے
ہماری راہ میں کوئی شجر نہیں آیا

نئی عمارتیں بنتی رہیں، مگر افسوس!
ہمارے حصے میں مٹی کا گھر نہیں آیا!

○

خواب جو نذرِ انتشار ہوئے!
میرے شعروں میں جلوہ بار ہوئے

قتل گاہوں پہ قفل پڑتے ہی
شہر در شہر جشنِ دار ہوئے

کیسا موسم ہے کھو گئے سائے
سارے اشجار شعلہ بار ہوئے

جلتا صحرا ہے میرے پیشِ نظر،
سارے چہرے پسِ غبار ہوئے

اپنی ہستی بھی آئینوں جیسی
گھر سے نکلے تو سنگسار ہوئے

ہر طرف پھیلتی ہوا کی طرح
اس کی چاہت میں بے دیار ہوئے

○

بجھی رُتوں کا کرم دل پہ بے حساب رہا
گرفتِ موجۂ صرصر میں یہ گلاب رہا!

یہ راز تو تجھے کھونے کے بعد مجھ پہ کھُلا
بلند قد سے مرے میرا انتخاب رہا

یہ اعتراف کراتا ہے مجھ سے سرکش خوں
کہ میرا فیصلہ میرے لئے عذاب رہا

ہتھیلیوں پہ میں اندر کی روشنی لے کر
تمام عمر ہواؤں کے ہمرکاب رہا

سیاہ شال میں لپٹی ہوئی سحر دے کر
عظیم لوگوں کے آنگن میں آفتاب رہا

○

شبِ سیاہ میں اتنا سراغ رکھ دینا
قدم قدم پہ لہو کے چراغ رکھ دینا

حساب لینا ہو "لمحاتِ صد بلا" کا اگر!!
مرے بدن میں ہزاروں دماغ رکھ دینا

بجھائی ہیں اگر آنکھیں تو سب کی آنکھوں میں
مہکتے خوابوں کے سرسبز باغ رکھ دینا

مَیں تشنگی کا ہوں پیکر تو میرے ہاتھوں پر
سمندروں کو بنا کر ایاغ رکھ دینا

مَیں اپنے کاندھے سے خوابوں کی لاش پھینک سکوں
مری حیات میں اتنا فراغ رکھ دینا

یہی بہت ہے کہ کاغذ کے ہاتھ پر اُٹھ کر!
حسین لفظوں میں زخموں کے داغ رکھ دینا

○

شور اٹھتا ہے نواحِ جاں کے اندر رات کو
ٹوٹتے ہیں دل پہ نادیدہ سے نشتر رات کو

تولتی ہے مجھ کو ہی میزان بن کر میری ذات
میرے اندر جاگتا ہے یومِ محشر رات کو

دن میں ریگِ دشت کی مانند تپتی ہے مگر
خشک آنکھوں سے ابلتا ہے سمندر رات کو

لوگ کہتے ہیں کہ میرا عہد کالی رات ہے
کوئی جگنو، کوئی تارہ ربِّ اکبر رات کو

دیکھتا ہوں دہر کے سب ضابطے جلتے ہوئے
شعلۂ دیدہ وری کا غذ پہ رکھ کر رات کو

اپنے گرد و پیش سے ہشیار رہنا ہر گھڑی
گشت پہ نکلیں گی تلواریں برادر رات کو

سرنگوں ہو جاتا ہے اظہر خمارِ سرکشی
آ ہی جاتا ہے اک ایسا موڑ اکثر رات کو

○

سمندر، کھیت، دلدل ہو گئے ہیں
نئے نقشے مکمل ہو گئے ہیں !!

ہرے پیڑوں سے بچ کر ہی گذرنا
کہ اب سائے بھی مقتل ہو گئے ہیں

عجب بستی ہے پرچھائیں کی خاطر
یہاں سب لوگ پاگل ہو گئے ہیں !

پہاڑی راستوں پر چلتے چلتے
ہمارے پاؤں اب شل ہو گئے ہیں

اسے کھوتے ہی سب گلرنگ منظر
مری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

ہمیں محبوب تھا غالب کا ورثہ
ہمارے گھر بھی جنگل ہو گئے ہیں

○

ہجر کے موسم نے شاخِ احساس کو یوں شاداب کیا
توڑ کے سب زخموں کے ٹانکے آنکھوں کو خونناب کیا

سارے دریا سارے سمندر کو ہم نے پایاب کیا
تب جا کر رنگوں نے ہم پر وا اپنا ہر باب کیا

خون کہاں تک پانی کرتے بانجھ رُتوں کی یورش میں
دیدہ وروں نے بالآخر اعلانِ شکستِ خواب کیا

تلواروں سے آنکھیں ملائیں نیزوں سے سرگوشی کی
فتح و ظفر کی سبز پری نے تب جا کر آداب کیا

بھیگے موسم، زلف کے سائے، اجلی شام کی نازک بانہیں
میرے عہد نے کیسے کیسے لمحوں کو نایاب کیا

اظہرِ عطائے نالۂ شبگیر دیکھنا
پیروں میں اپنے حلقۂ زنجیر دیکھنا

پھر شاہزادہ نکلا ہے گلگشت کے لئے
پھوٹے گی ایک غنچے کی تقدیر دیکھنا

تتلی، گلاب مانا ہیں جاذبِ نظر بہت
سر پہ لٹک رہی ہے جو شمشیر دیکھنا

شاید پسند آئے اسے طوفانِ برق و باد
ہے اک لرزتی چھت مری جاگیر دیکھنا

مت پوچھ کن عذابوں میں کاٹی ہے زندگی
چہرہ ہے گذرے لمحوں کی تصویر دیکھنا

دستِ شفق سے تا ورقِ گل کہیں جگہ
شاید ملے نوشتۂ تقدیر دیکھنا

○

رُوح میں اُترا ہوا دھوپ کا خنجر دیکھوں
اور خوابوں میں پگھلتا ہوا پیکر دیکھوں

وقت کہتے ہیں جسے آگ کا بہتا دریا
پھر بھی ہر شخص کی خواہش کہ اُتر کر دیکھوں

کیوں ہے آنکھوں کے دریچوں میں لہو کا چہرہ
تھوڑی فرصت جو ملے جسم کے اندر دیکھوں

کچھ تو اندازہ ہو سناٹوں کی گہرائی کا
پھینک کر آج میں آواز کا پتھر دیکھوں

آرزو جن کی اُفق تا بہ اُفق رنگ ملے!
ہائے ان آنکھوں سے جلتا ہوا منظر دیکھوں

○

اِتنی خطا پہ جبر کا سارا دباؤ تھا
مَیں درد کی صدا کا دَہکتا الاؤ تھا

اب اشک ریز ہیں وہاں سمتوں کے زاویے
اندھی مسافتوں کا جہاں پر پڑاؤ تھا

گذری رُتوں کا درد بسا تھا نفس نفس
آنکھیں لہو لہو تھیں بدن گھاؤ گھاؤ تھا

کیا پار کرتیں اس کو قیاسوں کی کشتیاں
جِس بحر میں یقین بھی کاغذ کی ناؤ تھا

صَدیوں کی دھند بن گیا غفلت کا ایک پل
کچھ اتنا تیز فکر و نظر کا بہاؤ تھا

کرتے تھے رقص ان پہ شعاعوں کے قافلے
جن راستوں پہ میرے لہو کا رچاؤ تھا

اَظہر دکھاتا فن کے نگینے کِسے وہاں؟
ہیروں سے بھی گراں جہاں پتھر کا بھاؤ تھا

وہ میرے واسطے کیا کیا نہ یار کرتا تھا
سُلگتے لمحوں کو شاخِ بہار کرتا تھا

وہ چھت پہ چاند کی کرنوں کی شال اوڑھے ہوئے
تمام رات مرا انتظار کرتا تھا

رخوں کے چاند لبوں کے گلاب رنگِ حنا
وہ مجھ پہ اپنے خزانے نثار کرتا تھا

بڑے سکون سے سُن کر تمام تاویلیں
بس اک نظر سے مجھے شرمسار کرتا تھا

یہ جانتا تھا کہ آوارہ ہوں مگر پھر بھی
خلوصِ دل سے مرا اعتبار کرتا تھا

نوازتا تھا وہ اشعار چوم کر میرے
نہ جانے کتنا مرے فن سے پیار کرتا تھا

محدودیت کو توڑنے والی لکیر ہوں
یہ اور بات اپنے بدن میں اسیر ہوں

جس کو تلاش آج تک اپنے ہدف کی ہے
تخلیق کی کمان کا وہ پہلا تیر ہوں

مجھ پر یہ سنگباری بس اتنی خطا پہ ہے
اقلیمِ بے حسی میں دلیلِ ضمیر ہوں

اشکوں کے موتی زخم کے ہیرے لباس پاس
اِس زاویے سے دیکھئے میں بھی امیر ہوں

سنّاٹوں کے غبار میں گم ہو گیا کہاں
جس کو تھا زعم شہرِ صدا کا سفیر ہوں

اظہر! ہر ایک دور میں دنیا کے سامنے
تاریخ جس کو رکھتی ہے ایسی نظیر ہوں

○

اپنے حق میں پیدا اک دامِ حریفائی نہ کر
پتھروں کے درمیاں تقسیم دانائی نہ کر

نوکِ خنجر چومتی ہے اس کو میرے شہر میں
آنکھ اپنی بند رکھ تشہیرِ بینائی نہ کر

چند ہی لمحوں میں ہو جاتے ہیں کتنے معجزے
شاہِ لشکر کش ابھی اعلانِ پسپائی نہ کر

چھین لے گی سر سے سارے سائے اک دن دیکھنا
میرا کہنا مان خوشبو سے شناسائی نہ کر

داعیِ تہذیبِ نو کے در پہ کس نے لکھ دیا
زخم بھر دے روح کا یا پھر مسیحائی نہ کر!

○

کہیں سراب کی صورت کہیں ندی ہوں میں
ہزاروں روپ ہیں میرے کہ زندگی ہوں میں

مرے لہو سے تو شمشیریں کند ہوتی ہیں
انا غریب کی، باغی کی سرکشی ہوں میں!

مری طلب ہے تو اندیشۂ خطر سے گذر
کہ دھند میں چھپے منظر کی دلکشی ہوں میں

مجھے بہار کا آنچل سمیٹ لیتا ہے
عظیم دوست تری آنکھ کی نمی ہوں میں!

لکھا ہے ہونٹوں پہ اس پھول جیسی لڑکی کے
تمام موسمِ گل کی شگفتگی ہوں میں

یہ چند لفظ بکھرنے سے روک لیتے ہیں
کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ زندگی ہوں میں

○

اِک دشتِ بے شجر ہے گھڑی دوپہر کی ہے
پیروں میں آبلے ہیں مصیبت سفر کی ہے

نوخیز ڈالیوں کی حفاظت کریں شجر
دستِ ہوس کو جستجو کچے ثمر کی ہے!

کرلی ہیں تیرے عشق میں سب انگلیاں قلم!
کتنی عجب اَدا ترے شوریدہ سر کی ہے

موجوں نے یہ پیام دیا اور سمٹ گئیں!
تیری شکستہ کشتی امانت بھنور کی ہے

آوارگی کے پیروں میں زنجیر ڈال دیں
یہ حیثیت کہاں کسی دیوار و دَر کی ہے

لرزیدہ جسم والوں کو عزمِ حسین رضؓ دے
خواہش ہر ایک نیزے کو پھر آج سر کی ہے

○

اندر کا اضطراب یوں نغموں میں لوگیا
ساتوں سُروں میں دَرد کی لہریں سموگیا

آنسو کا ایک قطرہ گرا اُس کی آنکھ سے
اور زندگی کی ساری اُمنگیں ڈبوگیا

دیکھی جو سرد جنگ ہر ایک پیڑ کے تلے
مَیں دھوپ میں جھلستی زمیں پر ہی سوگیا

ہر شخص کے بدن کو ہے چہرے کی جستجو
ہر چہرہ کہہ رہا ہے مرا جسم کھوگیا

کب تک جلے مکانوں کے لکھو گے مرثیے
اب خاک ڈالو ان پہ جو ہونا تھا ہوگیا

○

بہار پھولوں سے شاخیں سجونے آئی ہے
یا میرے زخموں میں نشتر چبھونے آئی ہے

یہ زینہ زینہ اترتی ہوئی سلونی شام !
مری پلک میں ستارے پرونے آئی ہے

میں آگ آگ ہوں اس پر بھی یہ سلگتی دھوپ
مرے وجود میں تحلیل ہونے آئی ہے

ہوا کے رتھ پہ حسیں بادلوں کی شہزادی
سلگتے صحرا کا دامن بھگونے آئی ہے

میں پل میں حلقۂ گرداب سے نکل آؤں
مگر یہ بھیڑ جو مجھ کو ڈبونے آئی ہے

اے زندگی یہاں پتھر کے لوگ رہتے ہیں
تو پتھروں میں کہاں خواب بونے آئی ہے

لہو میں ڈوبی ہوئی فتح بوڑھی ماں کی طرح
جوان بیٹوں کی میت پہ رونے آئی ہے

لرزتی کانپتی سادہ سی اک کرن اظہر!
مرے وجود میں مہتاب ہونے آئی ہے

مجھے سفر میں ہے خدشہ بدن پگھلنے کا!
خیال چھوڑ دے تو میرے ساتھ چلنے کا

عجیب رات ہے کٹتی نہیں کسی صورت
لگے ہے اب کوئی سورج نہیں نکلنے کا

لہُو لکھے گا تمہاری بھی موت کا فرمان
تماشہ دیکھ رہے ہو جو سر اُچھلنے کا

ابھی تو کچھ نہیں موسم ذرا بدلنے دو
کرشمہ دیکھنا پوشاک کے بدلنے کا

میں سانس سانس لئے تیرے قرب کی خواہش
عذاب جھیل رہا ہوں لہو میں جلنے کا

شمارِ زخم کی فرصت نہیں جنھیں اظہرؔ
جواز کیا لکھیں احساس کے کچلنے کا

○

ننھّے ننھّے کتنے پودوں کو جواں اُس نے کیا
یوں ہُوا کہ دھوپ ہی کو سائباں اس نے کیا

اندر اندر موجِ غم نے مجھ کو کاٹا عُمر بھر
لمحہ لمحہ اپنی ہستی کو دھواں اس نے کیا

جس کو ہر لمحہ دُعائیں بھیگتی پلکوں نے دیں
میری اپنی ذات کو بے نام و نشاں اس نے کیا

سانپ کی مانند جب ڈسنے لگی بے رونقی!
شہر کے سب راستوں کو خونفشاں اُس نے کیا

پھونک کر اظہرؔ طلسمِ منصبِ جاہ و حشم
ساری بستی کو اچانک بے زباں اُس نے کیا

○

سفّاکیت میں ڈوبی فنکاری ہو گئی ہے
دیواروں پر لہو سے گُلکاری ہو گئی ہے

ہم سرکشیدہ ایسی بستی میں ہیں جہاں پر
بے رحم قاتلوں کی سرداری ہو گئی ہے

کیسی عجب وبا ہے سنجیدہ لوگوں کو بھی
آئینہ دیکھنے کی بیماری ہو گئی ہے

رہتی تو تھی محبّت گہرائیوں میں دِل کی
اب یہ حسین شئے بھی بازاری ہو گئی ہے

اِک خِطّہ ہی نہیں اب ساری زمیں ہے بابُل
عام اِک ہُنر کی صورت بدکاری ہو گئی ہے

جلتے مکاں کے حق میں کیسے زبان کھولے
اظہرؔ! اب اس کی ہستی سرکاری ہو گئی ہے

○

بدن پہ خاکۂ گُل سا شگاف کرنے لگیں
تو دستِ سنگ کا ہم اعتراف کرنے لگیں

یتیم ہوتی ہے تاریخ ایسے لمحوں میں!
حریفِ دارہی جب اعتکاف کرنے لگیں

تو اور پائیں گی کیا بانجھ موسموں کے سوا
شجر سے شاخیں اگر اختلاف کرنے لگیں

عجب نہیں کہ ترے کپکپاتے ہاتھوں کا
یہ چاند اور ستارے طواف کرنے لگیں!

عذاب اترتا ہے تب ریت ریت ہونے کا
لہو کے جذبوں سے جب انحراف کرنے لگیں

○

خوف سے اس طرح بستی کا ہر اک گھر جاگے
جیسے لَو، بجھتے چراغوں کی لرز کر جاگے

سرحدیں بن گئیں شمشیر اکائی کے لیے!
کیسے قطرے کے وسیلے سے سمندر جاگے

اِن دنوں ظلِّ الٰہی پہ جنوں طاری ہے
دیکھئے کِس گھڑی ہنگامۂ محشر جاگے

کیا ہمارے ہی لئے ساری رتیں بانجھ ہوئیں
یا خدا چاروں طرف ریت کا منظر جاگے

خون کا قطرۂ آخر کفِ صحرا پہ رکھا
اب تو اس تپتے خرابے کا مقدّر جاگے

کوئی موسم ہو ترے درد کی البیلی کرن
موجِ صد رنگ کی صورت مِرے اندر جاگے

رات کی ساری کمائی ہے اسے سُورج کی کِرن
برگِ گل پہ جو چمکتا ہوا گوہر جاگے

سفیر دن کا مکاں سے نکالتا ہے مجھے
پھر ایک چیختے برزخ میں ڈالتا ہے مجھے

تھکن کے بوجھ سے جب لڑکھڑانے لگتا ہوں
مرے مکان کا نقشہ سنبھالتا ہے مجھے

ہزاروں چبھتے سوالات کی فضاؤں میں
مَیں سونے جاؤں تو بستر اُچھالتا ہے مجھے

نہ جانے کون سا موتی مرے وجود میں ہے
کہ علم و فن کا سمندر کھنگالتا ہے مجھے

مَیں دھنسنے لگتا ہوں جب بھی ہَوس کی دلدل میں
مرا ضمیر ہی باہر نکالتا ہے مجھے

مَیں عکس رنگ ہوں موسم کا آئینہ اظہرؔ
چھپا کے سینے میں صدیوں سے پالتا ہے مجھے

سورج کے ڈوبتے ہی یہ چولا بدلتے ہیں
ڈاکو محافظوں کی قبا میں نکلتے ہیں

مَیں نے نظامِ جبر پہ انگلی اٹھائی ہے
سب لوگ مجھ کو دیکھ کے رستہ بدلتے ہیں

مَیں تو بڑھانے نکلا تھا اَوروں کے حوصلے
میرے ہی سر سے خون کے دھارے ابلتے ہیں

لفظوں کے ماسوا مرا ہمراز کون ہے؟
سو میرے راز لفظوں کے پیکر میں ڈھلتے ہیں

اظہرؔ جوان اپنے تو اپنے لٹا چکے
اب تتلیوں کو دیکھ کے بس ہاتھ ملتے ہیں

ہر چند آشکار مری بے گناہی ہے
میرے خلاف صاحبِ زر کی گواہی ہے

اب اُن پہ منحصر ہے جسے چاہیں ٹٹول لیں!
اندھوں کے ہاتھ منصبِ عالم پناہی ہے

آثار سب نمایاں ہیں اِک تازہ جنگ کے
تلوار بیچتا ہے تو کیسا سپاہی ہے

شاید کسی کے پاس نہیں اس کا کوئی حل
چاروں طرف جو پھیلی بھیانک تباہی ہے

درویشِ بے گلیم ہوں نانِ جویں بہت
تجھ کو اگر ہوس ہے تو وہ مرغ و ماہی ہے

اظہر ہے جس کے ہاتھوں میں شمشیر برہنہ
سب کہہ رہے ہیں اس سے تری بادشاہی ہے

○

کیسے بچو گے دھند کے اندھے عذاب سے
برگشتہ ہو کے روشنی والی کتاب سے

ابھریں گے وہ نوشتۂ دیوار کی طرح
جن کو مٹا رہا ہے تعصب نصاب سے

ثروت اور اقتدار بڑے لوگ پا گئے
غربت کا تحفہ ہم کو ملا انقلاب سے

سب کو بہت کے خون سے لکھنا پڑا ہمیں
ملتا ہے ہر نظریے کا رشتہ سراب سے

اظہر حقیقتوں کے دہکتے ہوئے الاؤ!
شادابیاں نچوڑ رہے ہیں شباب سے

○

کچھ تو بتا اے دھوپ کی یلغار کیا ہوئے
تھی جن کی ذات سایۂ اشجار کیا ہوئے

ٹھوکر میں جن کی رہتی تھیں جابر حکومتیں
وہ صاحبانِ جبّہ و دستار کیا ہوئے

جو پاسدارِ عظمتِ نانِ جویں کے تھے
تھے خاک جن کو درہم و دینار کیا ہوئے

جن کے نقوشِ پا پہ بہاریں کریں قیام
وہ تارکینِ سبزہ و گلزار کیا ہوئے

جن کا وجود مرہمِ زخمِ حیات تھا
دستِ شفیق اور لبِ گلبار کیا ہوئے

وہ صاحبانِ صدق و یقیں مہرِ نیم شب
تاریکیوں میں تھے جو ضیا بار کیا ہوئے

اربابِ دار و گیر کی سختی کے باوجود
طاغوت کے لئے تھے جو تلوار کیا ہوئے

حُجرے کو اپنے چھوڑ کے سیلابِ ظلم میں
بن جاتے تھے جو آہنی دیوار کیا ہوئے

تاریکیوں کے سائے لپکنے سے پیش تر!
کرتے تھے جو ضمیر کو بیدار کیا ہوئے

اظہرؔ تھے جن کی ذات کے دشمن بھی معترف
وہ صاف گو، وہ صاحبِ کردار کیا ہوئے

○

تیرا خیال تجھ سے بچھڑنے کا غم رکھیں
تا عمر تیرے واسطے آنکھوں کو نم رکھیں

پانی، شجر کا سلسلہ اس موڑ تک ہی ہے
گر حوصلہ ہو آپ میں آگے قدم رکھیں

ڈھالے ہیں میرے دیدۂ تر نے مہ و نجوم
پلکوں پہ میری چاند ستارے علم رکھیں

اے کالی رات کوششِ بیعت فضول ہے
سو آفتاب ہم سرِ نوکِ قلم رکھیں

رکھ اپنے پاس خلعتِ دیدہ وری کی بھیک
اہلِ نظر تو اس کو نہ زیرِ قدم رکھیں

جاناں! یہی ہے مذہبِ آشفتگانِ عشق
تقدیر تیرے گیسوئے پیچاں سے خم رکھیں

○

سارا لہو بدن کا رواں مشتِ پر میں ہے
"دن ڈھل چکا ہے اور پرندہ سفر میں ہے"

چبھتے ہوئے سوال لئے روز کی طرح
تنہائی منتظر مری ویران گھر میں ہے

اے دوست عکس ہے ترے رنگیں لباس کا
یہ کائناتِ رنگ جو تتلی کے پَر میں ہے

گم گشتگی کے خوف سے ہر چہرہ ہے دھواں
یہ نسل بے یقینی کی کس رہگذر میں ہے

مَیں بھی قبا پہ "چاند ستارہ" سجاتا ہوں
میرا بھی نام حلقۂ نامعتبر میں ہے

کب سے ہیں کھلتے پھولوں کی آنکھیں لگی ہوئی
اظہر! وہ دلکشی مرے زخمِ ہنر میں ہے

○

خود اپنی آگ میں جلتا شباب ہوں جاناں
سنبھال مجھ کو بکھرتا گلاب ہوں جاناں

اتر کے تجھ میں بدن تیرا جگمگا دوں گا
میں کوئی ذرّہ نہیں آفتاب ہوں جاناں

ہر اک سوال جہاں آ کے سر پٹکتا ہے
میں اپنی ذات سے ایسا جواب ہوں جاناں

ہے جس کے لفظوں میں شامل ترے نفس کی مہک
میں دھڑکنوں کی لکھی وہ کتاب ہوں جاناں

جو ہو سکے تو مجھے قید کر لے آنکھوں میں
میں خواہشات کا آوارہ خواب ہوں جاناں

بے چہرگی کی دھند ہٹاتا نہیں کوئی !
میرا وجود کیا ہے بتاتا نہیں کوئی

اُترے رگوں میں خون کی سرگوشیاں سُنے
آنکھوں میں اس طرح سے سماتا نہیں کوئی

کیا سب سیاہ رات سے یارانہ کر چکے
مثلِ چراغ خود کو جلاتا نہیں کوئی

مجھ پہ ہے ختم منصبِ دار و رسن کہ اب
اُنگلی برائے نام کٹاتا نہیں کوئی

اِک ہاتھ منہ پہ جم گیا اور چیخ گھٹ گئی
پھر آگے کیا ہُوا، یہ بتاتا نہیں کوئی

آئے گی زندگی میں کہاں سے کوئی کرن
ماتھے پہ اپنے چاند سجاتا نہیں کوئی !

خواب تکمیلِ بشارت جل چکا
آنکھ میں اب نقش حیرانی کا ہے

مجھ پہ نیزے ہیں غلاموں کے تنے
پھر بھی سودا سر میں سلطانی کا ہے

طے ہوا قتلِ صدا کا مرحلہ!
آ گئے خوشبو کی نگہبانی کا ہے

شہر تو بس جائیں گے عالم پناہ
مسئلہ تو دل کی ویرانی کا ہے

تنکے ہیں اظہر لہو کی موج کے
یہ نتیجہ مرثیہ خوانی کا ہے

○

یہ صلہ احسانِ انسانی کا ہے
ذرّہ ذرّہ منتظر پانی کا ہے

ہو گئی ہے آج بینائی عذاب
ہر طرف منظر ستم رانی کا ہے

ہر کرن جیسے مسرّت کا لہو
جشن کس مجروح تابانی کا ہے

○

صحرا، شجر، پہاڑ، سمندر بدل گیا
جھپکی جو آنکھ سارا ہی منظر بدل گیا

جس کی بہادری کے قصیدے پڑھے گئے
نیزہ چمکتے ہی وہ دلاور بدل گیا

رگ رگ میں ایک موجۂ آتش کا رم رہا
ہر چند آفتاب کا تیور بدل گیا

میں بھی ہرے شجر کی طرح تھا کبھی مگر
محرومیوں کی دھوپ میں جل کر بدل گیا

در وا نہ مجھ پہ جب سے اصولوں کے ہو سکے
اظہر شناسا چہروں کا لشکر بدل گیا

○

دے کر گلاب خوابوں کے آنکھوں کی جھیل کو
وہ کاٹتا ہے گرم ہوا کی نکیل کو

دہلیزِ وقت سبز رتوں کا خراج دے
ہم آ گئے ہیں گرا کے بدن کی فصیل کو

دے کر سراغِ رہ کو لہو کا نیا لباس
کس نے کیا ہے مسخ ہر اک سنگِ میل کو

کس زاویے کی دھوپ مقدر میں ہے لکھی
رد کر چکی جو سائے کی ہر اک دلیل کو

کیا خوفِ سنگ فن کی صلیبوں پہ آج بھی
ہم سہہ رہے ہیں طنز کی زہریلی کیل کو

ماحول کے حصار میں اظہر ہیں نیم جاں
آنکھوں میں ہم لئے کسی شکلِ جمیل کو!

○

تقلید کی روش کا انوکھا مآل تھا
ہر آئینہ ہمارے لئے اک سوال تھا

اندر شکستِ ذات کا طوفان تھا بپا
پھر بھی وہ ہنس رہا تھا عجب باکمال تھا

امواجِ خواہشات جسے روندتی رہیں
میں رزم گاہِ زیست کا وہ پائمال تھا

کاٹا سفر ہتھیلی پہ رکھ کر شعاعِ ذات!
ورنہ ہر اک سمت اندھیروں کا جال تھا

اظہرؔ! اس حُسنِ سادہ کو تشبیہ کس سے دوں
وہ دلنواز آپ ہی اپنی مثال تھا

○

ستم کی دھوپ میں ممنوع جن کے سائے ہیں
وہ سب شجر مرے اجداد نے لگائے ہیں

اے میری پشت میں خنجر اتارنے والے
کبھی ترے لئے سینے پہ زخم کھائے ہیں

زباں کھلے تو وہاں سر زمیں پہ آتا ہے
یہ کیسے کاندھے پہ سر کو بچا کے لائے ہیں

ہیں آج اتنے غضبناک کیوں اندھیرے ہوا
کیا میرے نام پہ اس نے دیئے جلائے ہیں

نواحِ جاں میں در آیا ہے ہجر کا موسم
اداس آنکھوں میں کچھ اشک جگمگائے ہیں

آؤں جو ضد پہ قدموں تلے بحر و بر رکھوں
اور زخم زخم ہاتھوں پہ شمس و قمر رکھوں

اب بھی رگوں میں خون کا دریا ہے موجزن
کیسے عدو کے قدموں پہ تیغ و سپر رکھوں

کافی نہیں تجھے یہ لہو کی شہادتیں؟
کیا جاں نکال کر میں ترے ہاتھ پہ رکھوں

سوچا تھا آگے وادی میں خیمہ لگاؤں گا
آیا ہے حکم جاری میں اپنا سفر رکھوں

مجھ سے تو یہ نہ ہوگا کہ گھبرا کے طنز سے
اندھوں کے بیچ میں بھی نقوشِ ہنر رکھوں

اے پیکرِ صبا ترے دیدار کے لیے!!
کب تک میں اپنی آنکھیں یونہی دربدر رکھوں

تقسیم لمحے لمحے میں یوں ہو گئی حیات
فرصت نہیں کہ سوچ سکیں کیا ہے میری ذات!

ہم نے خود اپنی آنکھوں میں کانٹے چبھو لیے
تب جا کے ہاتھ آئی ہے لفظوں کی کائنات

کس کی تلاش ہے جو خلا میں بکھر گئے
رشتہ زمیں سے توڑ کے میرے تخیلات

حد سے سوا ہوا نئی تہذیب کا کرم
پوشیدہ اب نہیں رہے اسرارِ جنسیات

اظہر شعارِ ذات کو اپنی سپر بنا
ترے سیاہیوں کے لیے آ گئی ہے رات

○

یہ کس مقام پہ لائی ہے زندگی مجھکو؟
کہ ناگ کی طرح ڈستی ہے روشنی مجھ کو!

سپاہ و ملک و عَلَم تخت و تاج دے یارب!
جو تو نے بخشا مزاجِ شہنشہی مجھکو!!

ہزار طرح کے مجھ پر عذاب لاتی ہے
بہت عزیز ہے لیکن یہ سرکشی مجھکو!

میں کیسے جاؤں کہ مٹی قدم پکڑتی ہے
بہت بلاتی ہے شہروں کی دلکشی مجھ کو!

کبھی ہوس کا دہکتا الاؤ میں بھی تھا
عظیم لڑکی نظر سے بجھا گئی مجھ کو!

لہو کو پانی کی صورت بہا کے کیا پایا
خیال آتا ہے اظہر کبھی کبھی مجھکو!

○

تعبیر کی صلیب بہت اُن کو کھل گئی
خوابوں کی جھیل جن کی بصیرت نگل گئی

رگ رگ میں درد دین کے لہو دوڑنے لگا
تنہائیوں کو چھیڑ کے جب شام ڈھل گئی

آیا تھا اس کے کانپتے ہونٹوں کا جب خیال
بجلی سی لہر جسم کے اندر مچل گئی!!

اب تک تو سبز پتوں سے محروم ہیں شجر
کہنے کو لوگ کہتے رہیں رُت بدل گئی

ہم منتظر سحر کے رہے دشت خواب میں
اور کالی رات کتنے ہی سورج نگل گئی!

اظہر ہے بیسویں صدی کا وہ حرفِ آتشیں
جس کی ادائیگی میں زباں میری جل گئی

○

جب تک مرا وجود ہوا کا عدو نہ تھا
مانندِ برگِ خشک اڑا کو بہ کو نہ تھا

رنگین ساعتوں کے بھنور میں تھا ہر نفس
ٹوٹا بھنور تو میری رگوں میں لہو نہ تھا

اتری تہہِ شگفتہ مزاجی تلک ہے دھوپ
یوں آدمی تو پہلے کبھی شعلہ رو نہ تھا

اِس طرح سے خزاں کا مسلسل عذاب تھا
جیسے زمیں کے سینے میں سیلِ نمو نہ تھا

شاید تھا نہ ہر کوئی ہوا میں گھلا ہوا
ہر بستی دیکھی، فرد کوئی سرخرو نہ تھا

یوں کھو گئے تھے دل میں لئے تیری جستجو
اپنا خیال تک بھی دمِ جستجو نہ تھا

اظہر! شعاعِ درد نے چمکا دیا اسے
ورنہ حسین اتنا رخِ آرزو نہ تھا

چاند سے جھانکنا اور نیند کو غارت کرنا
اس کی فطرت میں ہے چپکے سے شرارت کرنا

رات کی ساری کمائی ہے ترے ہاتھوں پر
برگِ گل ننھے سے قطرے کی حفاظت کرنا

میری پیشانی، مرے ہونٹ، مرے بازو کو!
پھر عطا پھول سے ہونٹوں کی حرارت کرنا

حاکمِ وقت تری خاک اُڑا سکتا ہے
ہم سے دُرویشوں کا اعلانِ بغاوت کرنا

ہیرے کنکر جہاں قیمت میں ہوں یکساں اظہرؔ
ان زمینوں کی طرف سوچ کے ہجرت کرنا

○

یہ مرحلہ نہیں تھا ہمارے گمان میں
موجیں پناہ لیں گی کبھی بادبان میں!!

تشویش کا ہے مرحلہ عالم پناہ پر
مصروف اک پرندہ ہے اونچی اڑان میں

مت ڈھونڈ! میری آنکھوں میں تتلی شفق گلاب
خوابوں کی راکھ اڑتی ہے اب اس مکان میں

کن ناشناس لوگوں میں پیدا کیا ہمیں
مصروف پہلی سانس سے ہیں اِمتحان میں

یہ کیا کہ اس امیر نے شمشیر بیچ دی!
اظہرؔ تمام فوج تھی جس کی کمان میں

2576

○

ہٹا کے روح سے قیدِ مکاں مرے اللہ
بکھیر مجھ کو کراں تا کراں مرے اللہ

ترے سوا جو کسی سے طلب کروں کچھ بھی
تو چھین لینا تو مجھ سے زباں مرے اللہ

مجھے ہے گر کے سنبھلنے کا حوصلہ کافی
نہ دینا پیروں کو بیساکھیاں مرے اللہ

ہمارا عہد کہ صحرا کی دوپہر جیسا
بس ایک نام ترا سائباں مرے اللہ

یہ ہر مقام پہ گرنے سے روک لیتی ہے
خلش ضمیر کی رکھنا جواں مرے اللہ

تمام دیدۂ جوہر شناس فریادی
گہر اگلتیں نہیں سیپیاں مرے اللہ